ریاستیں ہیں، کتنے ہندو وظیفہ خوار ہیں، ان کے کتنے اداروں کو امداد ملتی ہے، ان کے معبدوں پر جاگیریں وقف ہیں، بحیثیت مجموعی ملازمتوں میں ان کا تناسب مسلمانوں سے کتنا زیادہ ہے، پھر یہ بھی قابلِ غور ہے، کہ مسلمان ریاستوں کے مقابلہ میں ہندو ریاستوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے، اس لئے آج جو آگ حیدر آباد کے خلاف لگائی جا رہی ہے، کیا کل اس کے شعلے ہندو ریاستوں میں نہ پہنچ جائیں گے، جائز حقوق کے لئے جد وجہد کرنا بُرا نہیں ہے، لیکن اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیکر نفرت کی آگ بھڑکانا کسی حیثیت سے مفید نہیں ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ حیدر آباد میں مزید اصلاحات کا مسئلہ در پیش ہے، جو ہندو اخبارات آزادی کے مدعی ہیں، انھیں چاہئے، کہ اس پمفلٹ کو شائع کریں، یا کم از کم اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں،

بالشتیوں کی دنیا مترجمہ جناب سید فخر الدین صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸؍، دفتر روزانہ ہند، نمبر ۱- ساگر دت لین کلکتہ،

یہ کتاب انگریزی زبان کے مشہور مصنف جوناتھن سیوفٹ (jo nathan Swift.) کی نہایت مقبول اور معروف کتاب ہے، مصنف نے اس میں ایک سیاح کے لباس میں بالشتیوں کی ایسی خیالی دنیا کے حالات دکھائے ہیں، جن کے قد کل چھ انچ کے ہیں، اسی تناسب سے یہاں کی ساری مخلوق نباتات، حیوانات، جمادات، پہاڑ، دریا، حکومت، فوج، مکانات، زندگی کے جملہ ساز وسامان چھوٹے چھوٹے ہیں، سید فخر الدین صاحب نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، ترجمہ سلیس اور کتاب اتنی دلچسپ ہے، کہ بغیر ختم کئے ہوئے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی،

"م"

جلد ۴۳	ماہ محرم الحرام ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۹ء	عدد ۳

مضامین

سیرۃ النبیؐ جلد ششم

جس کا موضوع اخلاقی تعلیمات ہے چھپ کر تیار ہے، شائقین جلد درخواستیں بھیجیں،

قیمت قسم اوّل ۵؎ قسم دوم للعہ بڑا سائز حجم ۶۱۲ صفحے، "منیجر"

شذرات

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چھٹی جلد بحمد اللہ کہ چھپ کر تمام ہو گئی، یہ ۶۱۲ صفحون مین ختم ہوئی، شروع مین ایک مقدمہ ہے جس مین اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی پوری تشریح ہے، اس کے بعد حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے عنوانون اور ذیلی عنوانون مین اخلاقی تعلیم کی تفصیل ہے،

مہتمم دار المصنفین مولانا مسعود علی صاحب ندوی امسال حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، خدا کا شکر ہے کہ وہ ۲۷ ذیحجہ کو بخیر وخوبی ہندوستان واپس تشریف لائے، اس مقدس سفر مین انھون نے برکتون اور سعادتون کے حصول کی پوری توفیق پائی، دار المصنفین ان کی بخیریت واپسی پر ان کو مخلصانہ مبارکباد پیش کرتا ہے،

بہار کی ہندوستانی کمیٹی اپنا کام مستعدی سے انجام دے رہی ہے، مولوی عبد الحق صاحب کی نگرانی مین ہندوستانی لغت، اور ڈاکٹر تاراچند کے تحت علمی اصطلاحون کا کام ہو رہا ہے، یہ پہلا موقع ہوگا جس مین ہندوستان کی تاریخ جو ہندو مسلمانون کی لڑائی کی اصلی جڑ ہے، اس طرح پڑھائی جائے گی کہ مسلمانون کو شکایت کا موقع نہ رہے،

اعلیحضرت حضور نظام سابع خلد اللہ ملکہ،

کا

ارشادِ گرامی

بدعاتِ محرم پر

محرم کے خونین واقعات سے کس مومن کا دل خون نہیں، اور جگر گوشۂ رسول ؐ اہلبیت اطہار رضی اللہ عنہم کے مصائب کی یاد سے کس مسلمان کا جگر شق نہین، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ غم کو غم کی حیثیت دی جاے، اور تولاے اہلبیت کرام کے صحیح آثار [illegible] جائین، جاہل مسلمانون نے ان واقعات کو لہو ولعب کا ذریعہ بنالیا ہے، اور اس نام سے وہ کچھ کیا جاتا ہے جس سے اسلام اپنے پیروون سے شرمسار ہے، اور صحیح یہ ہے کہ ہند کے کفرستان مین مسلمان محرم مین وہ کچھ کرتے ہین جو ایسے موحدین کے لئے زیبا نہین، ان منہیات اور بدعات کے خلاف علماے حق نے ہمیشہ آوازین بلند کی ہین، اور ان کو صفائی کے ساتھ خدا اور رسول کی ناراضی کا ذریعہ ظاہر کیا ہے، مگر ان کی باتون کو لوگون نے سمع قبول سے نہین سنا، ایران مین اعلیحضرت شہنشاہ پہلوی نے ان بدعات کا بزور قلع وقمع کیا ہے، اور عزاداری کے غلط اور خلاف شرع طریقون سے اپنی

رعایا کو باز رکھا ہے،

ہندوستان مین اس شاہانہ فرض کو صحیح طور سے اعلیحضرت حضور نظام سابع خلد اللہ ملکہ نے ادا فرمایا ہے، اور خود اپنے قلم گوہر بار سے اس مختصر فرمان کو لکھکر شائع فرمایا ہے، ہم بھی اس غرض سے کہ ہندوستان کے طول و عرض مین مسلمان، شاہِ دکن کے اس ارشاد گرامی سے فیض اٹھائین، معارف مین اسکو شائع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہین،

ارشاد گرامی کے آخر مین جس ربع صدی پہلے کی اصلاح کی طرف اشارہ ہے وہ وہ اصلاح ہے جو شہنشاہ پہلوی کے دور سے بھی پہلے خود اعلیٰ حضرت نے اقلیم دکن مین نافذ فرمائی تھی،

"صحیح تعریف عزاداریِ حسینؑ"

آہ مثل قرونِ اولیٰ فی زمانا وہ نفوس زکیہ (یعنی بزرگانِ دین) کہان "جو فلسفۂ شہادت" کے صحیح معنی و مفہوم سے واقف ہو کر اور "شہادت کبریٰ" کی عظمت کو سمجھکر اور تعلیم حسینیؑ سے درس لے کر ایسی "ہستی ذیشان" پر جس نے کہ جان و مال اور سارے کنبہ کو صرف "بقاے اعلاے حق" کے خاطر قربان کر دیا تھا، اس پر ساری عمر آہ و بکا کرتے رہے، برخلاف اس کے آجکل دورانِ ایام عزا مین جو جو بدنما منظر چوطرف نظر آتے ہین وہ یا تو "محض رسمی" طور پر دکھائی دیتے ہین یا "اجرت" وصول کرنے کے خاطر انجام پاتے ہین، یعنی وہ طبقہ یا تو ماتم کرنے والا ہوتا ہے یا منبر کے سامنے بیٹھکر لکھنوی ذاکر کے کلام کی داد اوچھل اوچھل کر دینے والا ہے یا زیادہ سے زیادہ رونے کا منھ بنانے والا یا آواز نکالنے والا ہوتا ہے، جبکہ ایک قطرہ آنسو آنکھ مین

دکھائی نہ دیتا ہو!!

اس کے سوا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جھنکہ کے ٹٹو کو کرایہ پر لاکر گلی کوچہ مین گشت کرا کے "ذوالجناح" کی تحقیر کی گئی ہے، یا بازارون مین کاغذ کے تابوت کو گشت کرا کے ندی کے قریب یا چٹ میدان مین زیر زمین دفن کر کے اس کی بے حرمتی کی گئی ہے یا سر بازار سر پیٹ کر ماتم کی وقعت کو تباہ کیا گیا ہے یا بعض وقت ماوشما کو "اکابر دین متین صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کی "تمثیل" بنا کر گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا گیا ہے، اور ایسے مذموم حرکات کر کے گروہِ بدمعاشان نے اپنے مذہب کی اپنے ہاتھون سراسر تحقیر غیر مذاہب کے آنکھون مین کرائی ہے!!

دوسری طرف ابھی تک ان جہلا کو نہ مذہب کے مالہٗ و ماعلیہ پر دسترس حاصل ہے اور نہ اس کی اصلی خوبی کو سمجھنے کی اُن کے سرون مین صلاحیت موجود ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ جس طبقہ سے ان کا تعلق ہے وہ محض "بازاری" ہے، ورنہ اگر یہ بات پیدا نہ ہوتی تو کیا مجال کہ ایسے مذموم حرکات اس سے سرزد ہوتے" (حاشا

بہرحال اب بھی وقت باقی ہے کہ ٹھنڈے دل سے ان امور پر غور کر کے اور ان بدعتون کو یک لخت چھوڑ کر کوئی دوسرا بہتر راستہ "فلاح دارین" کا اختیار کیا جائے جو نتیجۃً "باعثِ نجات" اپنے لئے ہو، ورنہ یاد رہے کہ وہ زمانہ دور نہین ہے، جب "عقول ناقدہ" ان پر ایسی گرفت کرینگے کہ اس وقت ان ہفوات کا تنقید کی زد پر ٹکنا امر محالات سے ہو جائے گا، کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ آجکل کے دہریت کے زمانہ مین کوئی چیز جو کہ مذہب سے منسوب ہو وہ پہلے "دلائل عقلی و نقلی" کی کسوٹی پر نہ کس لیجائے اس کو بے چون و چرا تسلیم کرنے کے لئے "روشن دماغ" تیار نہین ہین اور

امر واقعی بھی یہی ہے کہ جب تک آپ دریا خس و خاشاک سے پاک وصاف نہین ہوتا کبھی وہ گروہِ تشنگان کے جاذبِ نظر نہین بن سکتا،

ف۲، بہرحال جہانتک ممکن ہے جس طرح سے رُبع صدی قبل سے عیش وعشرت، کھیل کود اور مزخرفات کو محرم کے حدود سے خارج کرکے اس کو صحیح روشنی مین "دنیاے اسلام" کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اسی طرح تمام بدعتون کو بھی دکن کی حدتک ملیامیٹ کرکے صحیح معنون مین "عظمتِ ایامِ عزا" کو برقرار رکھا جانا ضروری ہے کہ منجملہ دیگر فرائض کے ہر مسلم فرمانروا کے ذمہ "حفاظتِ شعائرِ دین متین" بھی (از زدِ بے حرمتی) کی گئی ہے، جس کی گواہی نص قرآنی سے ملتی ہے کہ

"وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ"

سبحان اللہ اس سے بڑھ کر معاملۂ زیر بحث کی اور کیا توضیح وتشریح ہوسکتی ہے!!

مقالات

عرب اور امریکہ

یہ مضمون دراصل "عربوں کی جہازرانی" کے سلسلہ میں ۱۹۳۱ء میں لکھا گیا تھا، مگر چند حوالون کے ناقص ہونے کے سبب وہ اس میں شامل نہیں کیا گیا، ۱۹۳۶ء میں علی گڈھ مسلم کانفرنس کی جوبلی میں اسلامی علوم وفنون کے شعبہ میں پڑھکر سنایا گیا،

"س"

عام طور سے مشہور ہے کہ امریکہ کو کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں دریافت کیا ہے، یہ شہرت اس لحاظ سے تو صحیح ہے، کہ عام متمدن پرانی دنیا کو اس نئی دنیا سے پوری واقفیت اُسی وقت سے ہوئی، اور اسی کے بعد سے دونون میں میل جول اور ہر قسم کے علمی وتمدنی وتجارتی تعلقات قائم ہوئے، یہانتک کہ آج نئی اور پرانی دنیا ایک گھر کے دو آنگن بن گئے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں کہ کولمبس سے پہلے اس نئی دنیا میں پرانی دنیا کی کسی نووارد قوم یا اشخاص کے قدم نہیں پہونچے،

یہ مسئلہ کہ امریکہ تک کبھی عرب جہازران پہنچ چکے تھے، گو ہندوستان میں نیا ہو، مگر مصر کے بعض ممتاز فاضلوں نے اس پر متعدد اوقات میں بحثیں کی ہیں، علامہ زکی پاشا نے سسلی کے عرب جغرافیہ نویس ادریسی المتوفی ۵۶۰ھ کی نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق کا ایک حوالہ پیش کیا تھا جس میں بحر ظلمات

میں اندلس کے چند عرب نوجوان جہازرانوں کے جہاز چلانے کا ذکر ہے، مگر ابھی تک نہ تو مصر میں اور ہندوستان میں اس مسئلہ کے تمام اطراف پر بحث کی گئی ہے، اور نہ تمام ممکن مواد یکجا فراہم کیا گیا ہے،

اس سلسلہ میں حسب ذیل باتیں تنقیح کے قابل ہیں،

۱- کیا عربوں نے اور زیادہ عام لفظوں میں کیا مسلمانوں نے "ربع مسکون" کے پرانے نظریہ کی تنقید کی تھی،

۲- کیا ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصوں کا علم تھا،

۳- کیا ماوراے بحر ظلمات انھوں نے پہنچنے کی کوشش کی،

۴- کیا آج کل کے نئے محققین اس نظریہ کو قبول کر سکتے ہیں،

ذیل کی سطروں میں ان میں سے ہر ایک مسئلہ پر تلاش و فکر کے نتیجے پیش کرتا ہوں،

ربع مسکون بطلیموس نے دو خطوں کے تقاطع سے روے زمین کے چار برابر حصے کئے تھے ایک خط قطب جنوبی سے قطب شمالی تک فرض کیا تھا، اور دوسرا زمین کے بیچ سے آفتاب کے بالمقابل پہلے خط کو کاٹتا ہوا، (اس کو خط استوا کہتے ہیں) وسط افریقہ سے گذرتا ہے، اس طرح دو خطوں کے تقاطع سے زمین کے چار وضعی حصے ہوے، دو شمالی اور دو جنوبی، اور خط استوا ان دونوں شمالی اور ان دونوں جنوبی حصوں کے بیچ سے گذرتا ہے، بطلیموس کی راے یہ ہے، کہ انسانی آبادی روے زمین کے ان چار حصوں میں سے صرف ایک شمالی حصے میں ہے، اسی کو اصطلاح میں ربع مسکون کہتے ہیں (یعنی چوتھائی حصہ (ربع) جو آباد ہے (مسکون) باقی تین چوتھائی حصے زیادہ تر سمندروں میں غرق ہیں، اور کچھ گرمی اور سردی کی غیر معتدل شدت کے سبب سے سکونت کے قابل نہیں،

مسلمانوں نے شروع میں بطلیموس کے اس نظریہ کو بعینہٖ تسلیم کیا لیکن بہت جلد وہ اس پر شکوک اور اعتراضات وارد کرنے لگے بطلیموس کے حامیوں نے اسکی راے کی صحت پر فلسفیانہ اور طبعی دلائل

گھڑ کر کھڑے کئے، مگر دوسروں نے ان کو توڑ دیا، اور ایک مدت تک یہ مناظرہ گرم رہا، بیرونی، ابن رشد، طوسی، قطب شیرازی، شریف جرجانی، برجندی، قوشجی، اور چغمینی کی تصنیفات میں زمین کی ہیئت کے باب میں یہ بحثیں مذکور ہیں، ہیں یہاں مثال کیلئے نصیر طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کے تذکرہ اور اسکی شرح توضیح التذکرہ مؤلفہ نظام اعرج (تالیف ۷۱۱ھ) اور اسکے حاشیہ سے کچھ عبارتیں نقل کرتا ہوں،

وهذا التقسيم غير صحيح فاسد ايضا	یہ تقسیم صحیح نہیں، غلط ہے، اس لئے
لانا ما رأينا لهم في هذه المقدمة	کہ ان کے دعوی کے ثبوت میں کوئی شبہہ
شبهة فضلا من حجة فعلى هذا	بھی میں نے نہیں پایا، چہ جائیکہ کوئی دلیل
يحتمل ان يكون في الارباع الباقية	ان کے پاس ہو اس بنا پر یہ بالکل ممکن ہے
عمارات كثيرة لم يتصل الينا خبرهم	کہ زمین کی باقی چوتھائیوں میں بہت سی
لما بيننا وبينهم من البحار المغرقة	آبادیاں ہوں جن کی خبر ہم تک اسلئے
والجبال الشاهقة،	نہیں پہونچی، کہ ہمارے اور ان کے درمیان
(نسخہ قلمی دار المصنفین)	جدا کر دینے والے سمندر اور بڑے بڑے پہاڑ ہیں

اسی طرح جنوبی حصہ میں آفتاب کی شدت گرمی کے سبب سے عدم آبادی کا جو پرانا نظریہ تھا، اس پر بھی ضرب کاری لگائی اور کہا،

لجواز ان يكون مسكونا ولم يصل	اس امکان کے سبب سے کہ وہ بھی
الينا خبرهم للبحار العظيمة و	آباد ہوں، اور ہم تک ان کی خبر اسلئے
الجبال الشامخة الشاهقة	نہ پہونچی ہو کہ بڑے بڑے دریا اور پہاڑ
المانعتان من ان يصل خبرهم	بیچ میں حائل ہوں، جو ان کے حالات ہم
(کتاب مذکور)	تک پہنچنے سے مانع ہوں،

آخر میں اس نظریہ کی کہ صرف "ربع مسکون" ہی کیوں کھلا ہوا ہے، اعتراض اور جواب کے بعد لکھا کوئی سنجیدہ دلیل نہ پاکر کہا،

وبالجملة ليس لانكشاف هذا القدر الذي كور من الارض اعني الربع المسكون الشمالي سبب معلوم غير العناية الالهية و الا فما فضل احد الربعين الشماليين بها اي بالعمارة والسكنى دون الآخر مع تساوي ارتفاعهما بالقياس الى السماويات، (كتاب مذكور)

حاصل یہ کہ زمین کے شمالی چوتھائی حصہ کے صرف کھلے ہونے کا سوائے عنایتِ الٰہی کے کوئی سبب معلوم نہیں، ورنہ کوئی دلیل اس پر نہیں کہ کیوں ایک ہی شمالی چوتھائی حصہ آبادی اور رہنے کے لائق ہو اور دوسرا نہ ہو، حالانکہ اس کے سب حصوں کی وضع (پوزیشن) فلکیات کی نسبت سے برابر ہے،

شارح نے اس "عنایتِ الٰہی" کے نظریہ کو بھی تسلیم نہیں کیا، اور کہا کہ ممکن ہے کہ عنایت نے دوسرے ربع شمالی میں بھی آبادی رکھی ہو،

لجواز ان يكون الربع الآخر مسكونًا معمورًا ولم يصل الينا خبرهم، (كتاب مذكور)

اس کا پورا امکان ہے کہ دوسرا چوتھائی حصہ بھی معمور اور آباد ہو، اور وہاں کے رہنے والوں کا حال ہم کو معلوم نہ ہو،

اس بحث سے اندازہ ہوگا، کہ اس پرانی دنیا کے علاوہ دوسری دنیا کا نظریہ مسلمانوں نے علمی استدلال کے طریقہ سے سمجھا تھا، اور یونانی نظریہ ربع مسکون کی کوئی طبعی اور فلسفیانہ توجیہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، نویں صدی ہجری کے وسط میں قاضی زادہ رومی نے محمود چغمینی المتوفی سنہ ۴۵ھ، ۱۳۴۴ء کی ملخص کی شرح میں جس کو اس نے رصد خانہ سمرقند کے بانی سلطان الغ بیگ کے نام سے لکھا ہے، کہا ہے؛

وسائر الارباع خراب ظاهرًا و الا لوصل خبرهم الينا غالبًا و يحتمل ان يكون بيننا وبينهم بحار مفرقة وجبال شاهقة وبوادي بعيدة تمنع وصول الخبر الينا، غير ان احد الربعين الجنوبيين قد حكي فيه قليلًا من العمارة، (ص۱۱۲ مطبوعہ ۱۲۷۱ھ لکھنؤ)

اور باقی تین چوتھائی زمین بظاہر غیر آباد ہے، کہ اگر غیر آباد ہوتی، تو غالبًا اس کا حال ہم تک پہنچتا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور وہاں کے باشندوں کے درمیان بڑے سمندر، پہاڑ، اور دور دراز صحرا ایسے ہوں جو ان کی خبر کو ہم تک پہنچنے میں حائل ہوں لیکن یہ بیان کیا گیا ہے، کہ ایک جنوبی چوتھائی حصہ میں تھوڑی آبادی ہے،

اگر ایک ہی شمالی چوتھائی آباد ہے، تو پھر یہ مسئلہ مشتبہ رہا کہ دو شمالی رخوں میں سے کون آباد ہے، فوقانی یا تحتانی، تو چونکہ ربع مسکون ہی کے مسئلہ کو مسلمان مشتبہ سمجھ گئے تھے، اس لئے وہ اس کی علت بتانے میں بھی پس و پیش کرتے تھے، اسلئے انھوں نے صحیح طور سے یہ کہا کہ نیچے اور اوپر کی بحث اسلئے فضول ہے، کہ ہر ایک دوسرے کی نسبت سے نیچے اور اوپر ہے، تصریح کے شارح امام الدین لاہوری نے حاشیہ کی یہ عبارت نقل کی ہے،

ان في تعيين هذا الربع تعسرًا بل تعذرًا لان لو قيل هذا هو الربع الفوقاني لصدق على الآخر، (صفحہ ۵۵)

اس چوتھائی زمین کی تعیین مشکل ہے بلکہ محال ہے، کیونکہ اگر یہ کہا جائے، کہ وہ فوقانی ربع ہے، تو یہ فوقانی ہونا تو دوسرے کو بھی کہہ سکتے ہیں،

اسی کی شرح میں عصمت اللہ سہارنپوری نے کہا ہے،

لان كل منهما فوقاني بالنسبة

کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے اوپر کی

الی من علیہ | نسبت سے فوقانی ہو،

اس کے بعد تصریح کی عبارت حسب تحریر ملا عصمت اللہ حسب ذیل ہے:۔

والحاصل انہ لیس ھنا علامۃ	حاصل یہ کہ یہاں کوئی علامت ایسی نہیں
یمتاز احدھما عن الآخر و	ہے جس سے ایک حصہ دوسرے سے
لذلک نراھم یبھمون الکلام	ممتاز ہو سکے، اسلئے ہم دیکھتے ہیں کہ اہل
ویقولون المعمور احد	ہیئت اس مقام پر مشتبہ طریقہ سے یہ
الربعین،	کہہ دیتے ہیں، کہ دو شمالی ربعوں میں سے
(باب ملا عصمۃ اللہ ص۸۹)	ایک آباد ہے،

ملا عصمت اللہ اور امام الدین بعد کے لوگ ہیں، لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اگلوں کی نقل ہے،

ابن خلدون مغربی المتوفی ۸۰۸ھ نے مقدمہ میں رُبع سکون کے نظریہ کی تشریح کے بعد لکھا ہے،

"اور یہیں سے حکماء نے یہ اخذ کیا ہے، کہ خط استوا، اور جو اس کے پیچھے ہے، آبادی سے خالی ہے، اور ان حکماء پر یہ اعتراض کیا گیا ہے، کہ یہ مقام تو مشاہدہ اور سیاحوں کے متواتر بیانات سے ثابت ہے، کہ آباد ہے، تو پھر اس دعوی پر دلیل کیسے قائم ہوگی،

(یعنی دعوی ہی غلط ہے)

پھر قدیم حکماء کی طرف سے یہ بات بنائی ہے،

"بظاہر حکماء کا مقصد یہ نہیں ہے، کہ خط استوا کے پیچھے آبادی بالکل محال ہے، جب کہ ان کے استدلال نے ان کو یہاں تک پہنچایا ہے، کہ وہاں گرمی کی شدت کے سبب سے

پیدائش کا فساد قوی ہے، اور اسلئے آبادی اس میں محال ہے، یا بہت کم ممکن ہے، اور وہ ایسا ہی ہے، کیونکہ خط استوار اور جو اس کے پیچھے ہے، گو اس میں آبادی ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، مگر بہت کم ہے۔"

اس مسئلہ کو اس سے بہت پہلے ابن رشد المتوفی ۵۹۵ھ نے پیش کیا، اور کہا کہ خط استوار کے دونوں طرف جب یکساں صورت ہو، تو خط استوار کے جنوب میں کیوں آبادی نہ ہو،

"ابن رشد نے کہا ہے، کہ خط استوار معتدل ہے، اور اس کے جنوب میں جو زمین ہے، وہ ویسی ہی ہے جیسی اس کے شمال میں ہے، تو جس طرح خط استوار کے شمال میں آبادی ہے جنوب میں بھی ہوگی"، (مقدمہ ابن خلدون)

ابن خلدون اسی خیال کی مزید تشریح اور جواب دیتے ہوئے کہتا ہے،

"لیکن یہ کہنا کہ خط استوا میں آبادی محال ہے، تو متواتر بیان اسکی تردید کرتا ہے"،

(مقدمہ ص۴۳ مصر)

جو بات ابن رشد نے کہی وہی حسن بن احمد ہمدانی المتوفی ۳۳۴ھ / ۹۴۵ع نے جزیرۃ العرب میں کہی ہے،

واما ما خلف خط الاستواء الی	"لیکن خط استوار کے پیچھے جنوب تک اسکی
الجنوب فان طباعہ تکون علی طباع	طبعی کیفیت شمال کی طبعی کیفیت کے مانند
شق الشمال سواء فی جمیع احوالہ	ہر چیز میں ہوگی، لیکن صرف اسی قدر اختلاف
الا قدر ما ذکرنا فی کتاب سرائر	ہوگا، جس کو میں نے سرائر الحکمۃ میں
الحکمۃ من اختلاف حالی الشمس	لکھا ہے یعنی آفتاب کے نقطہ اوج اور
فی راس اوجھا ونقطۃ حضیضھا،	نقطہ حضیض میں اختلاف سے جو اثر پیدا ہوتا ہے

اس کے بعد لکھا ہے کہ بحر اعظم کی موج وطغیانی کی شدت کے سبب سے ادھر جنوبی سمت
(یعنی جنوبی افریقہ میں) سمندر کی طرف سے جانیکی کسی کو ہمت نہیں پڑتی،

بعد آلی نے آفتاب کے نقطۂ اوج وحضیض کا جو فرق پیدا کیا تھا، نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ
نے اسکو کمزور ثابت کیا، اور کہا،

فمن البعید ان یبلغ تاثیرھا الی	یہ دور از قیاس ہے، کہ آفتاب کی تاثیر اس
حد یصیر احد موضعین متساد ین	حد تک پہونچ جائے کہ دو مقام جو وضع
فی الوضع مسکونا والآخر غیر مسکون	(پوزیشن) میں یکساں ہوں ان میں سے ایک
(تقویم البلدان ابو الفدا صـ۵ پیرس)	آباد ہو، اور دوسرا غیر آباد ہو،

ادھر علما تو اس مناظرہ میں مصروف رہے، کہ وہاں آبادی ہے یا نہیں، یا عقلاً ہو سکتی ہے یا
نہیں، اور اُدھر کے کم لکھے پڑھے سیاح اور جہاز ران خط استوا کو پار کر کے افریقہ کی ہر سمت
میں تیر گئے،

جنوبی حصہ میں افریقہ کا جہانتک تعلق ہے، عرب تاجر اور سیاح اس کے گوشہ گوشہ
سے واقف ہو چکے تھے، جہاں جہان موجودہ زمانہ میں اہل یورپ پہنچے، مسافران عرب کے نشان
قدم برابر پائے، عملی عربی سیاح اور جہاز ران خط استوا کو پار کر کے افریقہ کے ایک ایک کونہ اور
گوشہ میں پہونچے، اور خط استوا سے نیچے رائس الرجاء الصالح (گڈ ھوپ) تک سب چھان مارا،
چنانچہ ابو عبد اللہ البکری کی صفۃ الافریقہ والمغرب ابن بطوطہ کے سفر نامہ کے آخری ابواب، اور
ابن خلدون کے مقدمہ اور تاریخ میں ان کے حالات موجود ہیں، لیکن اصلی باشندوں نے توحش اور
جہالت اور حیوانیت کے سبب سے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی،

ابن خلدون جنوبی افریقہ کے بعض مقامات سلا، تکرور، غانہ اور سلطنت مالی کا نام لیکر کہتا ہے

اور آج کے زمانہ میں یہ پوری سرزمین سوڈانی قوم کی مملکت میں شامل ہے، اور ان کے
ملک تک مراکش کے سوداگر جاتے ہیں، .... اور ان کے پیچھے جنوب میں کوئی قابل
ذکر آبادی نہیں، ہاں کچھ آدم صورت انسان ہیں، جو انسانوں کے مقابلہ میں جانوروں
سے زیادہ قریب ہیں، وہ صحراؤں اور غاروں میں رہتے ہیں، اور گھاس اور غلہ بن پکائے
کھاتے ہیں، اور ان میں ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں، وہ انسانوں کے شمار میں نہیں"

(مقدمہ صـ۴۵ مصر)

مشرقی افریقہ تو عربوں کا وطن ہو گیا، زنجبار پر وہ قابض تھے، اور سواحل میں مدگاسکر (قنبلو)
کے مقابل تک ان کا بحری گذرگاہ تھا، مغربی افریقہ گانا (غانہ) میں ان کی نوآبادی تھی، شمالی افریقہ
ان کی عظیم الشان سلطنتوں کا مرکز ہے، اور آج تک وہ اس پر قابض ہیں، اور جنوبی افریقہ کے حیوان نما
انسانوں کا حال ابھی پڑھ چکے، لیکن انھوں نے محنت کر کے ان میں سے اکثر جانوروں کو انسان
بنایا، اور کچھ کو ان کے جانشین اہل فرنگ نے بعد کو انسان بنایا، اور باقی آج بھی جانور ہیں، الغرض
"افریقہ کی ہر سمت میں عرب تاجر اور نوآباد پھیل گئے تھے، کانگو، زولو، کفر دریا (الکفرہ)
میں وہ آباد تھے، اور ان کے قدیم آثار موجود ہیں، ۱۹۰۳ء میں روڈیشیا شمالی ٹرانسوال
میں ایک عرب کی قبر ملی ہے، جس میں مرنے والے کا نام سلام اور تاریخ وفات ۵۹۵ھ ۱۱۹۸ع
کھدی ہے، اسی طرح اہل جرمنی نے چند سال ہوئے، مشرقی افریقہ کے اندرونی علاقہ میں
قدیم شہر نو کا موین انگا کے قریب قدیم عربی کتابیں پائے، جن کو وہ برلن عجائبخانہ لے گئے،
"پرتگالیوں کی تاریخ میں ہے کہ جب ان کے جہازات جنوبی مشرقی سواحلی افریقہ،
گڈ ھوپ اور نٹال کے درمیان سفر کر رہے تھے، تو انھوں نے عربوں کو پایا، ان کے جہازات
سے ساحل بھرا ہوا تھا، اور کفر دریا کے ملک سے بہت سا سونا اپنے جہازوں میں لاد چکے

تھے، تاکہ وہ اپنے ملکوں کو بیجا ئیں[1]"

مغربی افریقہ میں نائجیریا کا وسیع خطہ عربوں کی نو آبادیوں کا مرکز تھا، اور ہے، یہاں پر خصوصیت کیساتھ ہم کو مغربی افریقہ کے ایک گوشہ سے جس کو عرب غانہ اور اہل یورپ گائنا (Guinea.) کہتے ہیں، بحث ہے، اور جو قدیم زمانہ سے سونے کی سرزمین ہے،

غانہ | اہل عرب اس سونے کی سرزمین تک بہت پہلے پہنچ چکے تھے، عربی جغرافیوں میں اس کا نام بار بار آیا ہے، اور عجیب بات یہ ہو کہ ہر قوم میں اس ملک کا نام ہی سونا ہو گیا ہے، عربی میں خالص سونے کو تبر کہتے ہیں، یہی تبر اس کا عربوں میں نام ہے، چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں غانہ کا حال تفصیل سے زیادہ تبر میں لکھا ہے، یہ گائنا یورپ میں جا کر گنی کی صورت میں سونے کی اشرفی بن گئی، گائنا خطِ استوا کے جنوب میں مغربی افریقہ کے اس ساحل پر واقع ہے، جہاں سے جنوبی امریکہ اور پرانی دنیا کا ایک طرح سے محاذ پڑتا ہی، اسلئے اس موقع پر اسکی خاص اہمیت ہی،

اہل عرب گائنا کب پہونچے، اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن قیاس ہے، کہ دوسری صدی میں مصر اور نوبہ اور بجہ وغیرہ افریقی قبیلے یہاں کے سونے کا خراج مصر میں ادا کرتے تھے، اور وہاں مسلمان عمال اور مزدور آباد ہو چکے تھے[2]، پانچویں صدی ہجری کے اندلسی جغرافیہ نویس ابو عبید عبد اللہ البکری المتوفی ۴۸۷ھ ۱۰۹۴ء نے کتاب المسالک والممالک کے حصۂ "افریقہ کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقہ والمغرب" میں گائنا کا وہاں کے قبائل کا، ان کے بادشاہ کا اور اس کی سلطنت کا پورا حال لکھا ہو، اور وہاں کے مسلمانوں کی سکونت اور آمد و رفت کی اطلاع دی ہے، یہ حالات مصنف نے ۴۶۰ھ میں لکھے ہیں، شہر غانہ کے دو حصّے تھے، ایک میں مسلمان رہتے تھے جس میں ۱۲ مسجدیں تھیں، ایک جامع مسجد تھی، ان مسجدوں میں امام و موذن، اور علما، و فقہا سکونت پذیر تھے،

[1] یہ دونوں اقتباس مقتطف مصر اگست ۱۹۱۵ء کے مضمون الرحلات الافریقیۃ القدیمہ سے ماخوذ ہیں [2] طبری ذکر فتح افریقہ۔

دوسرے میں بادشاہ اور اس کے ارباب حکومت رہتے تھے، بادشاہی عمارت کے پاس بھی ایک مسجد بنی تھی جس میں وہ لوگ فریضۂ نماز ادا کرتے تھے، جو بادشاہ کے پاس آتے تھے، ملک کے دوسرے حصہ میں بھی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں، بادشاہ اور اس کے قبیلہ کے لوگ اس وقت تک بت پرست تھے، لیکن مسلمانوں کی پوری عزت کرتے تھے، لیکن اسی زمانہ میں بادشاہ نے ایک مسلمان کی تبلیغ سے اسلام قبول کر لیا، وہاں ایک ایسی عرب قوم بھی آباد تھی، جو بنو امیہ کے زمانہ میں فوج کی حیثیت سے آئی تھی، اور یہیں رہ پڑی، بعد کو وہ اپنا مذہب بھی بھول گئی،[1]

اس بیان سے معلوم ہوا، کہ عرب یہاں بنو امیہ ہی کے زمانہ میں یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر یا دوسری صدی ہجری کے شروع میں پہنچ چکے تھے،

چھٹی صدی ہجری میں غرناطہ کے ابو حامد اندلسی المتوفی ۵۹۵ھ نے جو اسپین سے لیکر چین تک سیاحت کر چکا تھا، اور بغداد میں اقامت گزین ہو گیا تھا، تحفۃ الالباب کے نام سے جغرافیہ اور عجائب عالم پر ایک کتاب لکھی ہے، اس میں وہ غانہ کے متعلق لکھتا ہے:-

وبلادھم متّصل المغرب الاعلیٰ المتصل بطنجۃ ممتداً اعلی بحر الظلمات[2]

ان کا ملک مراکش کے اس حصہ سے جو طنجہ سے ملا ہی اور بحر ظلمات (اطلانتک) کے سواحل پر پھیلا ہے، متصل ہے،

ابو حامد کا یہ بیان بہت مبہم ہے، مراکش شمال میں ہے، اور غانہ اس کے جنوب میں، اور دونوں کے بیچ میں صحرائے افریقہ ہے، لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اس سے واقف تھا، بہر حال اس کے زمانہ میں ان اطراف کے پانچ قبیلے مسلمان ہو چکے تھے، جن میں ایک غانہ کا قبیلہ تھا،

[1] کتاب المغرب فی صفۃ افریقہ و بلاد المغرب صفحات ۱۷۴، و ۱۷۵ و ۱۷۸ و ۱۷۹ مطبوعہ الجزائر ۱۹۱۱ء
[2] تحفۃ الالباب صفحات ۴۱ و ۴۲ پیرس،

"ان کے بادشاہوں میں سے پانچ قبیلے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، مسلمان ہوگئے! ان میں سے قریب تر غانہ ہے، جس کی ریگ میں خالص سونا پیدا ہوتا ہے، اور ان کے یہاں سونا بہت ہے"، (ص۱۱ و ص۱۲ پیرس)

اس کے بعد ادریسی مراکشی المتوفی ۵۶۰ھ نے سسلی میں بیٹھکر شاہ سسلی کے حکم سے جغرافیہ کی مشہور کتاب نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق لکھی، اس میں غانہ کے حال میں جیسا کہ ابن خلدون نے نقل کیا ہے، لکھا ہو کہ غانہ میں علوی سادات کی سلطنت ہو،

"گنی میں جیسا کہ کہا گیا ہے، بنی صالح نام علویوں کی سلطنت اور حکومت ہے رجاً کی کتاب کے مصنف (ادریسی) نے کہا ہے، کہ اس کے بانی کا نام صالح بن عبداللہ بن حسن بن حسین ہے،

ابن خلدون کہتا ہے کہ عبداللہ بن حسن کی اولاد میں صالح نام کوئی شخص معروف نہیں ہو،[1]

بہرحال ابن خلدون المتوفی ۸۰۸ھ کے زمانہ میں غانہ کا ملک سلطان مالی کے زیر حکومت تھا، مشہور سیاح ابن بطوطہ جو اسی زمانہ میں تھا، وہ اسی سلطان کے زمانہ میں غانہ پہنچا تھا، اس سلطان اور اسکی مملکت اور قوم کے حالات اس نے اپنے سفرنامہ کے خاتمہ میں بیان کئے ہیں! یہ لوگ دیندار مسلمان تھے، اور عربی زبان افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی سرکاری و مذہبی دونوں حیثیتوں سے رواج پذیر تھی، یہیں سے ابن بطوطہ سلطان مراکش کی دعوت پر تمام دنیا کا چکر لگا کر اپنے ملک میں واپس گیا ہے،[2]

ابو عبید بکری اندلسی ابو حامد غرناطی یاقوت رومی جغرافیہ کی ان تینوں کتابوں میں غانہ کی سونے کی بڑی بڑی داستانیں ہیں، کہ کس طرح عرب تاجر مراکش اور مغرب سے اونٹوں پر

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صف۴۶، معر ذکر اقلیم اول [2] سفرنامہ ابن بطوطہ آخری باب،

لاد کر نمک اور دوسرے معمولی سامان لیجاتے ہیں، اور وہاں سے سونا بھر کر واپس لاتے ہین، اس داستان کو یہاں زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں، مگر اس کو یاد رکھنا چاہئے، کہ آخری نتیجہ مین یہ بات کام آئے گی،

شمالی روس اور بحر بیرنگ

جنوب سے اب شمال کا رُخ کیجئے، عرب چوتھی صدی کے شروع میں خلیفہ مقتدر باللہ کی خلافت میں انتہائی شمالی روس تک پہنچ چکے تھے، جہاں رات صرف چار گھنٹوں کی ہوتی ہے، وہاں کا بادشاہ مسلمان ہوگیا تھا، اور خلیفہ سے خواہش کی تھی، کہ اس کی اور اس کی قوم کی تعلیم کے لئے کچھ لوگ بھیجے جائیں، خلیفہ نے ابن فضلان کی سرکردگی میں ایک وفد وہاں روانہ کیا، وہ آذربائیجان ہوکر نہر اتل یعنی والگا طے کرکے انتہائی شمالی روس کے قدیم شہر بلغار میں پہنچا، اور کچھ روز رہ کر وہاں سے واپس آیا، اس پورے سفر کی روداد اس وقت بھی مختصر طور سے معجم البلدان کے الفاظ بلغار، اور روس میں درج ہے، آٹھویں صدی میں ابن بطوطہ شمالی روس کے اس سرے پر پہنچا تھا، جس کے آگے شمالی قطب کی برفپوش زمین تھی، اور جہاں بقول ابن بطوطہ برف پر چلنے کے لئے کتوں کی گاڑیوں کی ضرورت تھی، اور یہ کتے بہت بیش قیمت تھے، اس وجہ سے ابن بطوطہ آگے نہ بڑھا،[1] یہ وہی سواری ہے، جس سے آج کل کے بہادر بھی قطب شمالی کی منزلوں کو طے کرتے ہیں،

روس کے انتہائی شمال پر دریائے بیرنگ ہے، اس کا ذکر بیرونی، نصیر الدین طوسی اور قطب الدین شیرازی نے کیا ہے، اور اس کا صحیح موقع بتایا ہے، بیرنگ ایشیا کی طرف آکر بحر الکاہل میں ملجاتا ہے، اور شمال کی طرف اسی آبنائے بیرنگ کی پتلی سی لکیر شمالی امریکہ (کناڈا) اور پرانی دنیا کی بیچ میں حائل ہے، مسلمانوں کا علمی قدم اس سمت میں اس پتلی لکیر تک آکر رُک گیا،

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ

تھا، جہاں سے شمالی امریکہ بحر برفستان کے پردہ میں چند قدم پرہ گیا تھا۔[1]

انتہائی آبادی

مسلمانوں میں علم ہیئت اور ریاضی جغرافیہ کا علم زیادہ تر یونان سے آیا تھا، خصوصاً بطلیموس کی کتاب الجغرافیہ اور مجسطی پر انھوں نے اپنی معلومات کی بنیاد کھڑی کی، بطلیموس نے خط استوار کو جو افریقہ سے گذرتا تھا، خشکی میں انتہائی آبادی قرار دیا تھا، کیونکہ اس کے خیال میں گرمی کی شدت کی وجہ سے انسانی آبادی اس کے بعد ممکن نہیں تھی، اور اسی طرح طول میں انتہائی آبادی افریقہ کے پار بحر محیط کے چند جزائر کو قرار دیا تھا، جن کو اہل عرب "جزائر خالدات" کہتے ہیں، جس کا صحیح ترجمہ "جزائر سعیدیا مبارکہ" ہے، جس کو بعض عرب اہل جغرافیہ اور اہل ہیئت نے اختیار کیا ہے، اور جو اصل میں لاطینی لفظ (Fortunatae) کا معرب ہے، اسی یونانی لفظ کو البکری نے اپنے جغرافیہ میں فرطناتس کے نام سے لکھا ہے، اس سے مقصود جزائر کنیری (Canaries) ہیں،

عام طور سے مشرقی اہل ہیئت و جغرافیہ ان کو مفقود اور پانی میں غرق سمجھتے ہیں، مگر مغربی جغرافیہ نویس اس سے پوری طرح واقف تھے، ابو عبید عبد اللہ بن عبد العزیز البکری اندلسی المتوفی ۴۸۷ھ لکھتا ہے،

"اور بحر محیط میں طنجہ کے مقابل اور کوہ ایڈلٹ کے سامنے وہ جزیرے ہیں، جن کا نام فرطناتس یعنی ہمیشہ سرسبز رہنے والے (سعیدہ) جزائر سعادات و خالدات) ہیں، ان کا یہ نام اسلئے پڑا، کہ ان کی پہاڑیاں قسم قسم کے میووں اور خوشبودار پھولوں سے معمور ہیں، یہ میوے اور پھول لگائے بغیر خود بخود اُگتے ہیں، ان کی زمینیں گھاس کے بجائے معطر پھولوں سے آباد ہیں، اور وہ بلاد بربر کے مغرب میں دریائے مذکور میں متفرق

[1] تقویم البلدان، ابو الفداء ص ۳۵، و تذکرہ نصیر طوسی تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب عربوں کی جہاز رانی، صفحہ ۱۱۳ و صفحہ ۱۱۶،

طور پر واقع ہیں[1]۔

دوسری طرف انتہائی آبادی جزیرہ تولی کو بتاتے ہیں جسکو برطانیہ کے اطراف میں اب عام طور پر آئسلینڈ کہا جاتا ہے،

زمین گول ہے اور جذب و کشش سے قائم ہے،

اس مسئلہ سے بھی اہل عرب واقف تھے، کہ زمین گول ہے، اور جذب و کشش کے اصول پر قائم ہے، کسی بیل کے سینگ یا ستون یا پہاڑ کی پشت پر یہ گیند رکھا ہوا نہیں ہے،

ابن خرداذبہ المتوفی ۳۰۰ھ کہتا ہے،

"زمین کی شکل گول ہے، جیسے گیند، جو فضائے آسمانی میں اس طرح رکھا ہوا ہے، جیسے انڈے کے اندر زردی، اور ہلکی ہوا، (نسیم) زمین کے چاروں طرف ہے، اور وہ چاروں طرف سے کشش کر رہی ہے، آسمان تک اسی طرح مخلوقات کے اجسام زمین پر ہیں کہ وہی نسیم ان کے بدنوں میں جو ہلکا پن ہے، اسکو کشش کرتی ہے، اور زمین اس کے ثقل کو کھینچتی ہے، کیونکہ زمین مثل اس پتھر کے ہے، جس کو لوہا کھینچتا ہے (یعنی مقناطیس)[2]

اس عبارت میں زمین کی گولائی اور جذب و کشش کے علاوہ جس حقیقت کو نسیم جیسی ہلکی ہلکی ہوا سے ادا کیا گیا ہے، آج آپ اس کو بے تکلف "ایتھر" کہتے ہیں، نویں صدی کے آخر کا عرب جہاز راں ابن ماجد مقناطیس کے بیان میں کہتا ہے،

وقیل انّ السبع السموات و	اور کہا گیا ہے کہ ساتوں آسمان اور
الارض معلقات بمقناطیس	زمین قدرت کے مقناطیس سے معلق
القدرة، (کتاب الفوائد ص ۱۲۳)	ہے"،

[1] المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ للبکری صفحہ ۱۰۹، الجیریا [2] کتاب المسالک والممالک ص ۴ لیڈن،

جذب و کشش کے مسئلہ کو اہلِ جغرافیہ کے علاوہ دوسرے حکمائے اسلام نے بھی بیان کیا ہے، مگر اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں،

زمین کو گول تو تمام حکمائے اسلام نے تسلیم کیا مگر مجھے اس دعوی پر وہ استدلال پیش کرنا ہے، جو اہلِ جغرافیہ کے قلم سے نکلا ہے،

ابن رستہ (۲۹۰ھ) تیسری صدی ہجری میں تھا، وہ زمین کے گول ہونے پر ستاروں کے طلوع و غروب اور ظہور و خفاء سے اس طرح محققانہ بحث کرتا ہے،

"تمام اہلِ علم نے اس پر اتفاق کیا ہے، کہ زمین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ خشکی و تری کی گیند کی طرح ہے، اور دلیل یہ ہے، کہ سورج چاند اور کل ستاروں کا طلوع و غروب زمین کے تمام کناروں میں ایک وقت نہیں ہوتا، بلکہ مشرقی مقامات میں ان کا طلوع مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے، اور ان کا غروب مشرقی مقامات میں مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے، اور یہ حوادث فلکی سے ظاہر ہے، جو آسمان میں ہوتے ہیں، تو ایک ہی حادثہ زمین کے تمام اطراف میں مختلف مقامات میں ہوتا ہے، جیسے چندر گرہن کہ اگر ایسے دو مختلف شہروں میں ان کو رصد کیا جائے، جو ایک مشرق میں ہو، اور دوسرا مغرب میں، تو مثلاً اگر مشرقی چندر گرہن کا وقت رات کے تیسرے گھنٹہ میں ہو تو......

(ابن رستہ صفہ ۱۲)

زمین کی گولائی پر آج کل جہازوں کے اولاً مستول پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے پورا جہاز نظر آنے سے جو استدلال کیا جاتا ہے، اس سے بھی وہ واقف تھے، مسعودی لکھتا ہے،

"اور جہاز جب سمندر کے بیچ میں ہوگا، تو دنباوند کے پہاڑ غائب ہو جائیں گے، اور نظر نہیں آئیں گے، اور جب دریا میں سو فرسخ کے قریب رہ جائے گا، تو ذرا سا پہاڑ کا

سرا نظر آئے گا، اور جیسے جیسے ساحل کے نزدیک ہوتے جائیں گے، پہاڑ بڑا ہوتا جائیگا اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ سمندر کا پانی گول شکل پر ہے اور یہی بحر روم میں حال ہے، یہ شام کے پہاڑ جو انطاکیہ اور لاذقیہ اور طرابلس اور جزیرۂ سائپرس کے ساحل پر ہیں، کہ جہاز میں نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں، اور ساحل کے قریب آتے ہوئے آہستہ آہستہ نظر آتے ہیں، (مروج الذہب ص ۱۹۵ پیرس)

ابو بکر ابن الفقیہ ہمدانی (۲۹۰ھ) اپنے جغرافیہ کتاب البلدان میں لکھتا ہے، :-

"کہتے ہیں کہ سمندر بھی گول ہے، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم ساحل سے بیچ سمندر میں چلے جاؤ، تو ساحل کے پہاڑ اور درخت آہستہ آہستہ تمھاری نظر سے غائب ہونے لگیں گے، پھر جب تم بیچ سمندر سے ساحل کی طرف آؤ، تو وہ آہستہ آہستہ پھر دکھائی دینے لگیں گے" (ص ۵۳ لیڈن)

یہ دلیل بعینہ وہی ہے جو آج بھی زمین کی گولائی پر عام طور سے پیش کیجاتی ہے،

زمین کے فوقانی اور تحتانی حصے اور رات اور دن

ہر چند کہ یہ مسئلہ عربی علم ہیئت میں آفتاب کے دور اور حرکت کے سلسلہ میں عام طور سے مذکور ہے، لیکن زمین کے تحتانی اور فوقانی حصوں کے تخصیص کیساتھ ذکر کرنے میں بے توجہی کی گئی ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے، کہ مسلمان اس مسئلہ ہی سے واقف نہ تھے، تیسری صدی ہجری کا مصنف ابن رستہ اپنی کتاب الاعلاق النفیسہ کے مقدمہ میں شب و روز کے چوبیس گھنٹوں اور جاڑا گرمی میں روز و شب کے گھٹنے اور بڑھنے کا ذکر کر کے کہتا ہے، :-

لانّ نصف الارض ابداً	کیونکہ نصف زمین میں ہمیشہ دن
نهارٌ مضیءٌ ونصفها لیل مظلمٌ	رہتا ہے، اور دوسرے نصف میں

يدل دوران عليها، — اندھیری رات اور یہ شب و روز اس زمین

(ص۹ لیڈن) — پر گردش میں ہیں،

چوتھی صدی کے آغاز کا مصنف مسعودی مروج الذہب میں اسکی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے

"زمین کی آبادی کا آغاز جزائر خالدات سے شمار کرتے ہیں، جو مغربی بحراوقیانوس میں واقع ہیں، یہ چھ آباد جزیرے ہیں، اور آبادی کی انتہا چین کی انتہائی آبادی پر ہے، ان دونوں کے درمیان ۱۲ گھنٹوں کی مسافت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آفتاب جب چین کے انتہائی حصہ میں ڈوبے گا، تو ان جزیروں میں جن کا ذکر ابھی ہوا، اور جو مغربی بحراوقیانوس میں واقع ہیں، دن ہوگا، اور جب ان جزیروں میں رات ہوگی، تو انتہائے چین میں دن ہوگا، اور یہ زمین کا نصف دائرہ ہے، اور وہی آبادی کا طول ہے جس سے وہ واقف ہوئے ہیں، (جلد ۱ صفحہ ۱۸۱ پیرس)

کرۂ ارض کے دوسری جانب آبادی،

ربع مسکون کا نظریہ ٹوٹ جانے کے بعد کرۂ ارض کی دوسری جانب آبادی کا تخیل بہت قریب ہوگیا، یہ تخیل قدیم سے قدیم تیسری صدی ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں میں ملتا ہے

ابن خردازبہ المتوفی ۳۰۰ھ اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے،

كان العمارة في كرة الارض — کرۂ زمین میں آبادی خط استوا کے بعد

بعد خط الاستواء اربع وعشرون — ۲۴ درجہ تک ہے، باقی کو بحر محیط نے ڈوبا دیا

درجة ثم الباقي قد غمره البحر — ہے، تو ہم زمین کے شمالی ربع پر آباد ہیں

الكبير فنحن على الربع الشمالي من — اور جنوبی ربع گرمی کی شدت کے سبب

الارض والربع الجنوبي خراب — سے ویران ہے، اور زمین کے دوسرے

لشدة الحر فيه والنصف الباقي — نصف میں جو ہمارے نیچے ہے کوئی

الذي تحتنا لا ساكن فيه (ص۵ لیڈن) — آباد نہیں،

اس اقتباس کا آخری فقرہ قابل التفات ہے، کہ وہ زمین کی دوسری جانب کو کم از کم خشکی اور آبادی کے قابل سمجھتا ہے، گو اسکی آبادی کا اسکو کوئی علم نہیں،

اس کے بعد اسی کے ایک ہمعصر ابن رستہ (۲۷۰ھ) کے قلم سے عجیب و غریب حقیقت تراوش ہوگئی ہے، وہ غلطی کیساتھ اس قدر تسلیم کرتا ہے،

وان الناس نزلوا في النصف الشمالي — اور آدمی نصف شمالی میں آباد ہیں قبہ

بين القبة وبنات النعش وذلك — اور بنات النعش کے بیچ میں، اور وہ

مقسوم على سبعة اقاليم، وباقي — سات اقلیموں پر منقسم ہے، اور باقی حصہ

ذلك غير مسكون وينزل في — غیر آباد ہے، اور نصف جنوبی میں جسکو

النصف الجنوبي من شاء الله — خدا چاہے اپنی مخلوقات سے آباد

من الخلق (الاعلاق النفيسه ابن رستہ ص۹ لیڈن) — کرے،

ابن رستہ ربع شمالی کے بجائے نصف شمالی کی آبادی کا قائل ہے، اور جنوب کی نسبت مشتبہ ہوکر کہتا ہے، "وہاں اپنی خلق میں سے جس کو چاہے بسائے" یہ پیشینگوئی انکشاف امریکہ سے پوری ہوئی،

بیرونی نصیر طوسی قطب الدین شیرازی، اور ان کے تلامذہ کے سوال و جواب اور رد و اعتراض سے لوگوں میں یہاں تک ہمت ہوئی، کہ طوالع الانظار کے مشہور مصنف اور ابن فضل اللہ العمری (مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے مصنف) کے استاذ ابو الثناء محمود بن ابی القاسم اصفہانی المتوفی ۷۴۹ھ/۱۳۴۸ء نے اس نظریہ کے پیش کرنے کی جرأت کی،

لا امنع ان یکون ما انکشف عنہ الماء من الارض من جہتنا منکشفا من الجہۃ الاخری ولا امنع ان یکون بہ من الحیوان والنبات والمعادن مثل ما عندنا او من انواع او اجناس اخری۔ (مسالک الابصار جلد ۱ ص ۳۱ مصر)

میں اس کو ممکن سمجھتا ہون کہ ہماری طرف زمین کا جو حصہ کھلا ہے، وہ دوسری طرف سے بھی کھلا ہو، اور اس کو بھی ممکن کہتا ہون کہ اس میں بھی وہی حیوان نباتات اور معدنیات ہوں، جیسے ہمارے حصہ میں ہیں، یا اور دوسرے قسم کے ہوں،

اس سے زیادہ تصریح اور کیا ہو گی، اسی لئے شاید ابن فضل اللہ نے ربع کے بجائے نصف ارض کو مکشوف قرار دیا،

والبحر محیط بنصف الارض احاطۃ متصلۃ دائرۃ بہا کالمنطقۃ لا یظہر منہا الا نصفہا وہو ما دارت علیہ الشمس فی قوس النہار مثل بیضۃ مغرقۃ فی ماء انکشف منہا ما انکشف وانغمر ما انغمر؛ (مسالک الابصار ص ۳ جلد ۱)

اور پانی نصف زمین کو چاروں طرف سے کمربند کی طرح گھیرے ہوئے ہے، زمین کا آدھا ہی حصہ کھلا ہے، اور یہ وہی ہے، جس پر آفتاب دائرۃ النہار میں پھرتا ہے، اس کی مثال اس انڈے کی ہے، جو پانی میں ڈوبا ہو، تو اس سے کھل جاتا ہے جو کھل جاتا ہے، اور ڈوب جاتا ہے جو ڈوب جاتا ہے،

لیکن اس سلسلہ میں صحیح بات وہ ہے، جو بیرونی نے اس سے تین سو برس پیشتر کہی تھی کہ اس قسم کے امور استدلال نہیں، بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہیں،

جعلوا العمارۃ فی احد الربعین الشمالیین، لا ان ذلک موجب امر طبعی فمزاج الہواء واحد لا یتباین، ولکن امثالہ من المعلومات موکول الی الخبر من جانب الثقۃ فکان الربع دون النصف ہو ظاہر الامر والاولی بان یؤخذ بہ الی ان یرد خبرہ خبر طارئ۔ (تقویم البلدان ابو الفدا ص ۱۱)

اس فن کے عالموں نے دو شمالی ربعوں میں سے ایک ربع کو آباد مانا ہے، اسلئے نہیں کہ اس کا کوئی طبعی سبب ہے، کیونکہ زمین کی ہر طرف ہوا کا مزاج یکساں ہے، لیکن بات یہ ہے کہ اس قسم کے معلومات کسی ثقہ کی خبر اور اطلاع پر مبنی ہوتی ہیں، اسلئے آباد حصہ چوتھائی ماننا بظاہر درست ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ اس نظر کو اس وقت تک مانا جائے، جب تک کسی نئی اطلاع سے اسکی تردید نہ ہو جائے،

ان علماء کو اپنے استدلال وجواب وسوال میں مصروف رہنے دیجئے، اور آئیے دوسری طرف ان جاہل جہازرانوں کی کوششوں پر ایک نگاہ ڈالیں، جو اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالکر بحر ظلمات کی شناوری میں مصروف ہیں، (باقی)

عربوں کی جہازرانی

مسلمانون نے فن جہازرانی میں جس قدر ترقیاں کین جس قدر جہاز بنائے، جہازوں کے بنانے کیلئے جس قدر کارخانے قائم کئے، جس قدر بندرگاہیں قائم کیں، ان سب کے متعلق تاریخی معلومات اسلامی تاریخوں میں نہایت منتشر و پراگندہ ہیں، مولینا سید سلیمان ندوی نے ان پراگندہ معلومات کو اس رسالہ میں یکجا کیا ہے، ضخامت ۱۹۹ صفحے قیمت :- عہ

"منیجر"

ارمغانِ احباب

یعنی

دلّی اور اسکے اطراف

آج سے پینتالیس برس پہلے

از مولینا حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

(۳)

پانی پت روز یک شنبہ ۲۹ر رجب، میں نے شب ہی کو ارادہ کرلیا تھا کہ ۴ بجے کے پسنجر پر پانی پت جاؤنگا، اسی واسطے سب اسباب یکجا کرکے رکھوا دیا، اور کالیخاں سے کہدیا کہ تین بجے جگا دینا، لیکن اس وقت ان کی بھی آنکھ نہ کھل سکی، اور اس وقت کے ارادہ میں یوں تبدیلی کی، کہ ۱۱ بجے دن کو روانہ ہوں، یہ خیال کرکے کہ ابھی دیر ہے، مولوی فضل اللہ سے رخصت ہونے چلا گیا، ان سے حکیم عبدالمجید خانصاحب کے کشتۂ طلاوجب الجواہر کے نسبت دریافت بھی کرنا تھا، وہاں گیا تو انھوں نے چائے کی دعوت کی، واپس آتے آتے وقت نکل گیا، پھر ارادہ ہوا کہ ۳ بجے کی گاڑی میں روانہ ہوں، چنانچہ اس خیال سے دو بجے اسٹیشن نماز ظہر ادا کرکے آگیا بھائی جی اور محمد بھی آئے، ٹہلتے رہے، ان کا ارادہ ایک ہفتہ یہاں ٹھہرنے کا ہے، محمد اس عرصہ میں اٹاوہ چلے جائیں گے، اور وہ ایک ہفتہ کے بعد سیدھے دیوبند جائینگے، میرا ارادہ یہ ہے کہ ایک ہفتہ میں پانی پت انبالہ سرہند ہو کر دیوبند پہنچ جاؤں، پھر میں اور وہ بالاتفاق سہارنپور رڑکی اور گنگوہ جائیں گے، اگر منظور الٰہی ہے، چنانچہ تین بجے کی گاڑی پر میں سوار ہوا،

حسنِ اتفاق سے اس گاڑی پر مولوی ابراہیم صاحب کرنال کے رہنے والے بھی سوار تھے، یہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب[۱] پانی پتی کے شاگرد ہیں، پانی پت جاتے ہیں، ان کی وجہ سے راستہ بھر بہت دلچسپی رہی، اور اجنبیت کی وجہ کر مجھ کو جو دقتیں پیش آنے والی تھیں، ان کا بھی اندیشہ جاتا رہا، راستہ ہی میں عصر کی نماز ریل پر پڑھی، ۶ بجے گاڑی پانی پت پہنچی؛

مولینا عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی پانی پت دہلی سے ۵۲ میل ہے، اور ۱۱۔ کرایہ ہے، پانی پت پہنچکر انھوں نے دو مزدور کئے، ایک میرے واسطے ایک اپنے واسطے، خود اپنی جاے قیام پر گئے، اور میرے مزدور سے کہدیا کہ ان کو مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے یہاں لیجاؤ، میں آکر مسجد میں ٹھہرا، مولینا عبدالرحمٰن صاحب بہت کبیر السن ہیں، وہ مسجد میں نہیں آتے، ان کو پانچ چھ برس سے نقرس کا عارضہ ہے، اور ایک سال سے نزول الماء بھی ہوگیا ہے، کبھی مہینوں نہیں آتے، کبھی جمعہ جمعہ آتے ہیں، کبھی روز عصر کے وقت، مکان اُن کا مسجد سے متصل ہے، زنانہ مکان کے بالاخانہ پر رہتے ہیں، اس وجہ سے آمد و رفت میں دقت بھی ہوتی ہے، بہت خلوت پسند اور دائم صائم ہیں، اسی مسجد کے ایک حجرہ میں پیر محمد ایک میانجی رہتے ہیں، پیر مرد ہیں، انھوں نے میری بہت خاطر کی، بعد عشا کے کھانا لائے، مجھ کو فی الجملہ یہاں تکلیف ہوئی، پیشتر سے یہ معلوم نہ تھا، کہ یہاں سراے بھی ہے، ورنہ دو روز کے واسطے وہاں ٹھہر جاتا، معلوم جب ہوا، کہ میں یہاں ٹھہر چکا ہوں، اب یہاں سے اٹھنا مناسب نہیں ہے،

قاری عبدالسلام صاحب روز دوشنبہ یکم شعبان، میں کل یہ لکھنے کو بھول گیا کہ اسٹیشن سے آتے وقت میں نے راستہ میں چاند دیکھا، میرے حساب سے یہ چاند ۲۹ر کو ہوا، لیکن یہاں آکر سنا کہ آج ۳۰ر تاریخ ہے، صبح سے دوپہر تک مسجد ہی میں رہا، دس بجے کے قریب اطلاع ہونے پر مولوی عبدالسلام صاحب آئے، یہ قاری

---

[۱] قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی کے نام سے مشہور ہیں، شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد، اس زمانہ کے بہت کم علماء نے آپ سے حدیث پڑھی، اور قرأت سیکھی، ۱۳۱۴ھ میں اس سفر کے دو برس بعد وفات ہوئی، "س"

صاحب کے صاحبزادے ہیں، انھون نے آکر بہت معذرت کی، کہ مجھ کو مجملاً آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی، ورنہ میں حاضر ہوتا، صبح کی نماز مین میں آیا تھا، مگر ضرورت شدید کی وجہ سے چلا گیا، اس کے بعد انھون نے قاری صاحب سے اطلاع کی، انھوں نے بعد نماز ظہر کے بلانے کو کہا، اس عرصہ میں ایک مخدوم زادے، قاضی ثناء اللہ[1] صاحب کے رشتہ داروں میں مجھ سے آکر ملے، اور چاء کی دعوت کی، اور ایک شخص مولوی محمد حسین صاحب رامپور کے رہنے والے آج کل قاری صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، قرات سبعہ حاصل کرتے ہیں، وہ بھی ملے، ان دونوں بزرگوں نے میری ایسی مدارات کی، کہ میں ان کی عنایتوں کا تہ دل سے شکر گذار ہوں، مولوی محمد حسین سے معلوم ہوا کہ قاری صاحب کو مولینا اسحاق صاحب سے بالاضافہ مسلسل بالاولیہ کی سماعت ہے حقیقی سماعت اخوند منصور سے ہے، اور ان کو مولینا اسحاق صاحب سے، مجھکو اس بات کے سننے سے نہایت ہی رنج ہوا، کیونکہ میں زیادہ تر مسلسل بالاولیہ کے اشتیاق میں آیا تھا، ظہر کے بعد قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور مسلسل کی درخواست کی، انھوں نے مسلسل بالاولیہ سنائی، اور یہ بھی کہا کہ مجھ کو بالحقیقۃ اخوند منصور سے اسکی سماعت ہے، اور ان کو میان صاحب سے، اور میاں صاحب کو بھی ایک ولایتی سے، اور ان کو حضرت شاہ صاحب سے، اور بالاضافہ مجھ کو اور مولوی عبد القیوم صاحب[2] کو مولینا اسحاق صاحب سے ہے، اور میاں صاحب کو بالاضافہ شاہ صاحب سے، بعد مفارقت طویلہ کے حقیقۃ کی نوبت نہیں آئی، اسکے بعد میں نے اوائل صحاح ستہ کے سنائے، اور اسکی اجازت انھوں نے دی، اور میرے واسطے بایں الفاظ دعا فرمائی، کہ "اللہ تعالیٰ تمھارے پڑھنے پڑھانے میں برکت دے، اور نیت بخیر رکھے" میں نے سند لکھنے کی درخواست اس واسطے نہیں کی، کہ وہ آنکھ سے معذور ہیں، دوسرے سے لکھوائیں گے تطویل ہوگی، اور مجھکو رہنا بہت کم ہی، بہر حال جو میری غرض تھی وہ حاصل ہوگئی،

[1] قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی، شاگرد شاہ ولی اللہ صاحب [2] مولوی عبد القیوم صاحب بھوپالی مولینا شاہ اسمٰعیل شہید کے صاحبزادہ ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی، "س"

مولینا کا درس

آج کل مولوی صاحب باوجود کبر سن و عذر شدید کے تین سبق پڑھاتے ہیں، دو سبق تو قرات سبعہ کے، ایک عورتوں کو اور ایک مردوں کو، اور ایک سبق موطا کا، یہ سبق وہی صاحب پڑھتے ہیں جو رامپور کے رہنے والے ہیں، مولوی صاحب سے رخصت ہو کر میں باہر آیا، اور انہی مخدوم زادہ صاحب کے ساتھ زیارت مشاہد کے واسطے چلا،

پانی پت کے مزارات

پہلے بو علی شرف قلندرؒ کے مزار پر آیا، یہ بہت وسیع حظیرہ ہے، اور نہایت آراستہ مقبرہ ہے، اندر سنگ مرمر کا فرش ہے، آٹھ ستون اس میں کسوٹی کے پتھر کے لگے ہیں، ان کی قبر پر فاتحہ پڑھا، اندر ایک مقبرہ ہے، اس میں مبارز خان کی قبر ہے، مشہور یہ ہے، کہ یہ ان کے محبوب تھے، انکی قبر پر فاتحہ پڑھا،

قاضی ثناء اللہ صاحب کا گھر،

پھر قاضی ثناء اللہ صاحب مرحوم کے دولت خانہ پر آیا، بہت بڑے بڑے محلات ہیں لیکن اب شکست ہو گئے ہیں، ان کے اب کوئی اولاد پسری میں نہیں ہے، دختری اولاد میں کچھ لوگ ہیں، ان کی خاص نشست کے مکان میں، اب مدرسہ اسلامیہ ہے، یہ بیس برس سے جاری ہے، مولوی محفوظ اللہ صاحب نے جو قاضی صاحب کے پوتے تھے، ۱۲۹۲ھ میں اس کو جاری کیا تھا، لیکن افسوس ہے، کہ ان کا اسی سال انتقال ہو گیا، اور یہ مدرسہ انکی زندگی میں نشو و نما کو نہ پہونچا، مولوی راغب اللہ صاحب اس مدرسہ مین مدرس عربی ہیں،

یہ بزرگ مولوی محب اللہ صاحب کے بیٹے ہیں جنھوں نے اول اول اپنی صحت سے لکھنؤ مطبع مصطفائی میں کلام مجید چھپوایا تھا، مولوی راغب اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی، بہت خلق و مروت سے پیش آئے، جس وقت میں گیا ہوں ملا جلال کا سبق پڑھا رہے تھے، وہاں سے اٹھکر مدرسۂ قرات میں آیا، اسکے مدرس حافظ عبد الرحمن صاحب نابینا ہیں، انھوں نے اس ناچیز کی حد سے زیادہ توقیر کی، اس مدرسہ میں اٹھارہ طالب علم باہر کے ہیں، باقی شہر کے، حافظ عبد الرحمن صاحب نے باوجود بد مزگی طبیعت کے میری

فرمایش سے ایک رکوع سنایا، یہ اہل علم بھی ہیں، قرأت سبعہ کے متعدد سبق انکے یہاں ہوتے ہیں،

قاضی صاحب کا مزار وہاں سے اُٹھکر قاضی صاحب کے مزار پر آیا، یہ مزار بھی گو پختہ ہے لیکن سقف وستون گنبد وغیرہ کچھ نہیں ہیں، چار دیواری کے اندر ان کا مزار ہی اور باہر ان کے صاجزادوں مولوی دلیل اللہ و مولوی احمد اللہ صاحب وغیرہ کا، ان سب پر میں نے فاتحہ پڑھا،

خواجہ شمس الدین ترک کا مزار، وہاں سے خواجہ شمس الدین ترک علیہ الرحمۃ کے مزار پر آیا، یہ شہر سے باہر ہے، یہاں بھی بہت دھوم دھام ہے، فاتحہ پڑھکر آگے بڑھا، انہی کے مزار سے کچھ دور آگے مولوی غوث علی شاہ صاحب[1] کا مزار ہے،

غوث علی شاہ صاحب یہ بہت مشہور بزرگ ہیں، ہمیشہ سیاحت میں ان کی گذری، آخر کو شاہ بو علی قلندر کے مقبرہ میں قیام فرمایا، اور یہیں انتقال کیا، مزار اون کا ان کی وصیت کے موافق شہر سے باہر بنایا گیا، ان پر فاتحہ پڑھا،

بدر شہید پھر حضرت امام بدر الدین شہید کے مزار پر حاضر ہوا، یہ شہر سے بہت دور ہے، ان کا مزار بھی بہت آراستہ ہے، اون کے مزار سے کچھ فاصلہ پر ان کے لشکر کے علم بردار حضرت سید علی اکبر کا مزار ہے، یہ مزار بھی بے سقف وستون ہے، ایک چار دیواری کے اندر ہے، مجھ کو یہ جگہ بہت پسند آئی، بہت دلچسپ ہے، اس شہر میں چار درگاہوں کے واسطے ایک گاؤں معاف ہے اسی سے ان کے مصارف ہیں،

شاہ بو علی قلندر ایک شاہ بو علی قلندر کا مزار، یہ سب مزاروں سے زیادہ دھوم دھام کا ہے، دونوں وقت یہاں نوبت بجتی ہے، دوسرا خواجہ شمس الدین ترک کا، تیسرا امام بدر الدین کا، چوتھا سید جلال الدین کبیر الاولیا کا، یہ بزرگ مخدوم صاحب کے لقب سے مشہور ہیں، پانی پت کے مخدوم زادے ان ہی

[1] مولوی غوث علی شاہ صاحب بہار کے تھے، استھاوان مونگیر یا استھاوان پٹنہ ان کا وطن تھا،

کی اولاد میں ہیں، قاضی ثناء اللہ صاحب بھی انہی کی اولاد میں سے تھے، اون کے مزار پر بھی خاکسار حاضر ہوا،

شہر پانی پت پانی پت بہت پرانا شہر ہے، غدر سے پیشتر ضلع یہیں تھا، اب کرنال میں ہے، اس شہر میں ایک سو چودہ مسجدیں ہیں، اور آٹھ سو سے زیادہ حافظ ہیں، قرآن شریف کے مدرسے بھی کئی ہیں، یہ شہر چار حصوں پر منقسم ہے، ایک حصہ انصاریوں کا، ان کے متعلقین اور شاگرد پیشہ و رعایا وغیرہ سب اسی محلہ میں ہیں، اُن کی معافیاں بھی اسی جانب ہیں، اسی محلہ میں قاری عبدالرحمٰن صاحب رہتے ہیں، دوسرا مخدوم زادوں کا اس میں قاضی صاحب کا مکان ہے، اور مخدوم صاحب کی درگاہ ہے، ان لوگوں کی معافیاں اسی جانب ہیں، اور رعایا کے مکانات اسی محلہ میں ہیں، تیسرا افغانوں کا، چوتھا راجپوتوں کا، ایک حصہ سے نکلئے تو بڑے بڑے پھاٹک ملتے ہیں، آبادی اچھی ہے، سب چیز دن کو دیکھ کر مغرب کے وقت میں مسجد آیا، یہاں آکر مولوی محمد حسین رامپوری و قاضی عبدالخالق مخدوم زادہ سے لطف وحکایات میں شب بسر ہوئی،

سرہند کا سفر روز سہ شنبہ دویم شعبان، تین بجے اُٹھکر میں نے احتیاطاً وضو کر لیا، اور پانی پت کی آبادی سے نکل کر اسٹیشن آیا، گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی، وہاں میں نے جو خیال کیا تو اسباب میں لنگی نہ تھی، مگر اب اتنا وقت نہ تھا، کہ میں وہاں جاتا اور آتا، اور آج کا قیام بھی میں نہیں چاہتا تھا، اسی اثنا میں چار بج گئے، تھوڑی دیر کے بعد میں نے اُٹھکر صبح کی نماز پڑھی، اور ٹکٹ لیکر گاڑی پر سوار ہو گیا، یہاں سے کمپ انبالہ کے ۱۲؍ پڑے، میری رائے یہ ہوئی، کہ پہلے سرہند ہو آؤں، پھر مولوی محمد جعفر صاحب سے ملاقات کروں، شاید وہ روکیں تو وہاں کا جانا رہ جائے گا، اس خیال سے میں نے کمپ انبالہ پہونچکر دوسرا ٹکٹ سرہند کا لیا، یہاں گاڑی بدلی جاتی ہے، جو گاڑی کلکتہ سے الہ آباد دہلی ہوتے ہوئے آتی ہے، وہ سیدھی کمپ انبالہ سے کالکا چلی جاتی ہے، جو شملہ کا اسٹیشن ہے، دوسری گاڑی

لاہور جانے والی آتی ہے، اوس پر لاہور جانے والے مسافر اس گاڑی سے اتر کر سوار ہوجاتے ہیں، کمپ سے سرہند کا ٹکٹ ۲، ر کو ملا، یہاں سے دس بجے روانہ ہوا، اور ۱۲ بجے کے قریب سرہند پہونچا، یہاں سے مرقد مبارک بہت دور ہے، تاہم ۶ ر میں یکہ ہوگیا، اور میں خانقاہ شریف میں پہونچا،

سرہند یہ خانقاہ شہر سے علیحدہ ہے، اصل یہ ہے کہ سرہند اب بہت ویران ہوگیا ہے، عشر عشیر بھی اب آبادی نہیں رہی، میلوں تک بنیادیں اور سڑکیں نظر آتی ہیں، جو اب کھلے میدان میں پڑی ہیں، اس وجہ سے آبادی ایک گوشہ میں ہوگئی ہے، بلکہ دو حصوں پر منقسم ہوگئی ہے، ایک وہی پرانا شہر سرہند، دوسرا خانقاہ شریف کے دوسرے جانب ہے، اس کا نام بسی ہے، یہ بہت پر رونق ہے،

بہرحال خانقاہ شریف پہنچکر پہلے میں مسجد گیا، وہاں ولایتیوں کا ہجوم تھا،

خلیفہ صاحب ظہر کی نماز کے بعد خلیفہ صاحب سے ملا، ان کا نام سید محمد حسین ہے، اصل میں مالیر کوٹلہ کے رہنے والے سنجیدہ متواضع متین، خلیق، منتظم معلوم ہوتے ہیں، خانقاہ شریف کے متولی بھی ہیں، انھوں نے ملاقات کے بعد میرا اسباب اٹھوا کر اپنے حجرہ میں منگوالیا، اس کے بعد خدا بخش خادم آستانہ ایک پیرمرد کو بلاکر حکم دیا، کہ مجھکو زیارت کے واسطے لیجائے، خدا بخش مجھ کو ساتھ لیگئے، قفل کھولکر کنجی میری حوالہ کی کہ جبتک دل چاہے بیٹھئے، پھر بند کرکے کنجی مجھ کو دیدیجئے گا،

مجدد صاحب کا مزار میں اس گنبد کے اندر گیا، ایک بہت بڑی قبر ہے، جس پر سبز ریشمی کام کی بہت بڑی شال جو شاید اسی غرض سے بنوائی گئی ہو پڑی ہوئی ہے، یہ مرقد مبارک حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی روح اللہ روحہ واوصل الینا فتوحہ کا ہے، اس کے پاس مشرق کے جانب تین قبریں اور ہیں، ایک دیوار سے ملی ہوئی مختصر سی، اور دو بٹ کر ان دونوں پر ایک سرخ شال پڑی ہوئی ہے، اون میں سے ایک مزار مبارک خواجہ محمد صادقؒ کا ہے، دوسرا جار الرحمۃ خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ

علیہما کا، اور جو قبر دیوار سے ملی ہوئی ہے، اس میں اشتباہ ہے کہ آیا کسی صاحبزادہ کی ہے یا خلیفہ کی، بہرحال دیر تک میں وہاں بیٹھا، وہاں سے نکل کر دروازہ بند کرکے اور مزارات پر فاتحہ پڑھا،

دوسرے مزارات اوسی سے متصل ایک چھوٹا گنبد اور ہے، اس میں تین قبریں ہیں، وسط میں حضرت خواجہ محمد یحییٰ بن امام ربانی رحمہما اللہ کی ہے اور اسکے دونوں پہلوؤں میں ایک قبر شاہ فقیر اللہ بن شاہ زین العابدین ابن شاہ محمد یحییٰؒ کی، دوسری شاہ رضی الدین بن شاہ زین العابدین موصوف کی، ان پر فاتحہ پڑھکر باہر نکلا یہاں مزارات بہت ہیں، اکثر حضرت کے عشائر و قبائل و خلفاء و مریدین کے و بیشتر شاہزادوں[۱] اور امراو سلاطین کے جن کو حضرت سے عقیدت تھی، اکثر مزاروں پر فاتحہ پڑھکر باہر آیا، کنجی خادم کو دی، اس وقت کھانا مہمانوں اور مسافروں کو تقسیم ہورہا تھا، میرے واسطے بھی ایک قاب پلاؤ کی خلیفہ صاحب نے بہت تکلف کے ساتھ بھیجا، ہرچند کہ مجھکو خواہش نہ تھی، کیونکہ کمپ انبالہ سے کھاکر میں چلا تھا، تاہم ردّ دعوت کو معیوب سمجھ کر میں نے قبول کیا، اس کے بعد پھر میں زیارتوں کے واسطے خانقاہ شریف کے احاطہ سے باہر آیا،

باغ کے احاطہ میں بھی مختلف حضرات کے مزار ہیں، سب سے پہلے حضرت قطب العالم خواجہ محمد زبیر کا مرقد منور ہے (بن شیخ ابو العلی بن حضرت خواجہ حجۃ اللہ نقشبند ثانی بن حضرت ایشانؒ) ان پر فاتحہ پڑھ کر باہر آیا،

مزار حضرت خواجہ محمد معصوم ایشان اس کے بعد حضرت ایشان کے مزار کا گنبد ہے، اس میں پانچ مزار برابر برابر ہیں، اور تین مزار پائین ہیں، تین پائین کے مزار شاید خلفاء کے ہیں، اور برابر جو مزار ہیں ان میں سب سے بڑا مزار بیچ میں حضرت عروۃ الوثقی خواجہ محمد معصوم حضرت ایشان[۲] کا ہے، اس کے داہنے جانب حضرت ایشان کے مزار کے متصل حضرت خواجہ محمد اشرف فرزند چہارم حضرت ایشان کا مزار ہے، اس کے بعد حضرت قیوم الزمان خواجہ محمد صبغۃ اللہ فرزند نخستین حضرت ایشان کا مزار ہے اور بائیں جانب حضرت ایشانؒ کے مزار کے متصل حضرت

[۱] کابل کے افغان امرا، اور سلاطین کے یہ مزار ہیں، [۲] حضرت مجدد کے فرزند و خلیفہ ۱۰۷۹ھ میں وفات پائی،

مروج الشریعۃ خواجہ عبید اللہ بن حضرت ایشان کا مزار ہے، اس کے متصل حضرت خواجہ اہل اللہ بن خواجہ عبید اللہ کا مزار ہے، اس مزار میں اشتباہ تھا، اس واسطے اس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:-

"مخفی نماند کہ مرقد مبارک حضرت شیخ ابو العلیٰ در عمدۃ المقامات بمعہ برادر دوئی کہ شیخ محمد عمر نام دارند، در قبہ شریف والد ایشان قرار دادہ اند، و تصریح نمودہ اند کہ این دو برادران در قبہ والا ایشان حضرت خواجہ محمد نقشبند ثانی مدفون اند و صاحب این قبر کہ متصل قبر شریف حضرت خواجہ عبید اللہ است، حضرت خواجہ شیخ اہل اللہ قرار دادہ کہ فرزند ثالث قیوم الزمان خواجہ محمد صبغۃ اللہ است و می نویسند کہ در آخر عمر از دار الارشاد سرہند شریف بدار الخلافہ دہلی بطریق سیر تشریف بردہ بودند آنجا رحلت نمودہ تابوت ایشان از آنجا بدار الارشاد آوردند و در روضہ منورہ حضرت عروۃ الوثقیٰ متصل قبر مبارک حضرت مروج الشریعۃ دفن کردند رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین واللہ اعلم"

اور حضرت قیوم الزمان خواجہ عبید اللہ کے مزار مبارک پر یہ عبارت منقوش ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین سیدنا محمد والہ وصحبہ اجمعین، اما بعد مخفی نماند کہ این مرقد منور حضرت مروج الشریعۃ عبید اللہ بن حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم است رضی اللہ تعالیٰ عنہما ولادتش در ماہ رجب سنہ [illegible]ھ وفاتش بتاریخ نوزدہم ربیع الاول روز جمعہ وقت اشراق در سنہ [illegible]ھ چنانچہ ازین تاریخ ظاہر می شود، کہ بوقت وفات عمر شریف ایشان چہل وچہار بود، در کتاب اولیۃ القیومیت مذکور است کہ حضرت مروج الشریعۃ عبید اللہ را درون گنبد حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم در جنب قرآن حضرت سمت مشرق مدفون ساختہ و اولاد آنجناب ہشت تن اند، پنج پسران و سہ دختران، اما پسران یکے عبد الرحیم دوم دیگرے عبد الرحمن این ہر دو در طفولیت فوت شدند، و دیگر خدمت شیخ محمد ہادی

کہ فرزند بزرگ آنجناب است، و دیگر حضرت خواجہ محمد پارسا و دیگر شیخ سالم واما دختران یکے فضل النساء منسوبہ محمد اسماعیل و دیگر شایستہ بیگم منسوبہ میر فضل اللہ و دیگر حسن النساء منسوبہ شیخ محمد اسماعیل و مخفی نماند کہ قبر حضرت شیخ محمد ہادی درون گنبد روضہ حضرت عروۃ الوثقیٰ مغرب جنوب است و گنبدے خرد بران بنا شدہ است وفاتش در رجب روز جمعہ و قبر حضرت خواجہ محمد پارسا بیرون گنبد حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم بر کنج صفہ پاس [illegible] صفہ سمت و مشرق وفاتش سنہ ۱۱ھ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، و قبر شیخ محمد سالم بیرون گنبد حضرت عروۃ الوثقیٰ"۔

یہ خاص عبارت بہت بے ربط ہے، متولین خانقاہ شریف کی لکھی ہوئی نہیں ہے، کسی زائر نے لکھ دی ہے، انہی بزرگ کی لکھی ہوئی اور بھی عبارتیں تھیں، بعض بعض قبروں پر میں نے التفات نہیں کیا، ایک عبارت صرف نقل کی تھی، وہ لکھ دی، اسی گنبد کے جانب گوشۂ غرب و جنوب میں ایک چھوٹا سا گنبد ہے، اس میں دو مزار ہیں، ایک خواجہ غلام معصوم الملقب بہ معصوم ثانی ابن خواجہ محمد اسمٰعیل کا، دوسرا خواجہ محمد اسمٰعیل بن خواجہ محمد صبغۃ اللہ بن حضرت ایشان رح کا اور بڑے گنبد کے باہر گوشۂ جنوب و غرب میں دوسرا چھوٹا سا گنبد ہے، اس میں بھی کئی مزار ہیں، بیچ میں حضرت خواجہ محمد پارسا ابن خواجہ عبید اللہ بن حضرت ایشان رح کا ہے، اور اس بڑے گنبد سے شمال کے جانب ایک اور گنبد ہے، اس میں حضرت خواجہ محمد صدیق بن حضرت ایشان رح کا مزار ہے، اور تین قبریں اور بھی ہیں، وہ معلوم نہیں کسکی ہیں، انہی حضرت سے ہمارے حضرت شاہ محمد صابر علم اللہی[1] قدس سرہٗ نے استفادہ کیا تھا اور اسی سمت کو باغ سے باہر کچھ فاصلہ پر ایک گنبد ہے، اس میں حضرت حجۃ اللہ خواجہ محمد نقشبند ثانی رحمۃ اللہ اور ان کے صاحبزادوں کا مزار ہے، ان سب پر فاتحہ پڑھکر یہ روسیاہ اپنی شامت اعمال کا معترف

[1] رائے بریلوی،

باغ سے باہر نکلا اور خانقاہ شریف میں عصر کی نماز پڑھکر پھر باہر آیا،

خانقاہ شریف کی پشت پر ایک گنبد اور ہے، اس میں حضرت خواجہ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ بن حضرت ایشانؒ کا مزار ہے، ان پر بھی فاتحہ پڑھا، خدا ان بزرگوں کی برکت سے اس روسیاہ کی حالت بدل دے، اُخری اُولیٰ سے بہتر کرے، اور جمعیت ظاہری و باطنی عطا فرمائے، زیارات سے فارغ ہوکر اور خلیفہ صاحب سے رخصت ہوکر اسٹیشن آیا، ساڑھے سات بجے گاڑی آئی، اس پر سوار ہوکر انبالہ گیا، اور ایک سرائے میں ٹھہر گیا، یہاں توکل شاہ صاحب ایک بڑے مشہور و معروف بزرگ سنے جاتے ہیں؛ ان سے انشاء اللہ تعالیٰ ملکر کل کیمپ انبالہ جاؤنگا،

توکل شاہ صاحب،

روز چہار شنبہ سیوم شعبان، حوائج ضروری اور کھانے سے فارغ ہوکر ۱۱ بجے کے قریب شہر گیا، ادھر اودھر پھر کر ملک تاج الدین ملتان عرف لکھی شاہ کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھا، اسی کے قریب ایک مسجد ہے، وہاں گیا، ایک نوجوان بیٹھے ہوئے تھے، ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، اتفاق سے وہ کرنال کے رہنے والے توکل شاہ صاحب کے مرید تھے، اور یہاں استفادہ کی غرض سے ٹھہرے ہوئے تھے، ان سے معلوم ہوا، کہ شاہ صاحب مجدّدی ہیں، اور سلوک بھی مجددیہ طریقہ کے موافق ان کے یہاں کا معمول ہے، ظہر سے پہلے کسی سے نہیں ملتے، ظہر کی نماز کے واسطے جب نکلتے ہیں، تو لوگوں سے ملاقات ہوجاتی ہے، مجھکو پہلے سے بھی اتنا معلوم تھا، اسی وجہ سے میں نے قصداً آنے میں دیر کی تھی؛ جب تک میں وہاں بیٹھا رہا، وہ مثنوی کے اشعار پڑھتے رہے، مجھکو بہت لطف حاصل ہوا، ظہر کے وقت وہاں سے انحضرت شاہ صاحب سے ملنے گیا، اس وقت تک وہ برآمد نہیں ہوئے تھے، کچھ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، جو ان کے یہاں آتے رہتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد برآمد ہوئے، آتے ہی وضو کیا، اس کے بعد پھر کر ہماری طرف بیٹھے، وظیفہ پڑھتے جاتے تھے، مجھ سے صرف اس قدر دریافت کیا، کہ کہاں آئے تھے، کیوں آئے تھے، پھر مشغول ہوگئے، تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ اب معاف کرو، یہ کہکر اندر چلے گئے، بہت ضعیف

اور معمولی وضع میں ہیں، ملبس و مسکن وغیرہ میں کچھ تکلف نہیں ہے، ان کے اوضاع و طریقہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ بہت وارستہ مزاج عالی حوصلہ باہمہ و بےہمہ صاحب نسبت ہیں، جب تک میں بیٹھا رہا، میری حالت بہت متغیر رہی، ان کے مزاج میں جذب و سلوک ہے، از خود رفتگی و خود فراموشی بڑھی ہوئی ہے، وہاں کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ مرتاض زیادہ ہیں، گو کہ ادراک نسبت کے واسطے چشم بصیرت درکار ہے لیکن اس کو رباطن کے نزدیک نسبت قویہ رکھتے ہیں، اور مشائخ کے رسوم ظاہری کے متقید نہیں ہیں، مجھکو جو بات اونکی بہت پسند آئی، وہ ازخود رفتگی ہے، ؎

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز — کان سوختہ را جان شد و آواز نیامد
این مدعیان در طلبش بے خبرانند — کان را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اون کی زبان پنجابی ہے، میں چونکہ اس سے ناآشنا ہوں اس واسطے گفتگو کا لطف حاصل نہیں ہوا، اور وہ خود بھی ایسے مستغرق تھے، کہ مجھکو موقع نہیں ملا چونکہ میرے سفر کا زمانہ بہت ممتد ہوگیا ہے اس واسطے افسوس کیساتھ وہاں سے یکہ کرکے کیمپ انبالہ روانہ ہوگیا، سرہند کے راستہ میں شیخ اللہ دیا تاجر سے ملاقات ہوگئی تھی، ان کی دوکان خاص کیمپ میں ہے، اونھوں نے مجھ سے نہایت فروتنی سے استدعا کی تھی، کہ جب کیمپ آنے کا اتفاق ہو تو پہلے انہی کے یہاں آؤں، چنانچہ میں پہلے ان ہی کے یہاں آیا، یہاں پہنچکر مولوی محمد جعفر کو دریافت کیا، انھون نے اپنا آدمی ساتھ کردیا، مکان پر پہنچکر جو تحقیق کیا تو معلوم ہوا، کہ مولوی صاحب کئی دن ہوے کھرنولے، ریاست پٹیالہ چلے گئے ہیں، مجھ کو نہایت ہی افسوس ہے، کہ اس سفر کی صعوبت مین نے انہی کے واسطے اٹھائی، اور وہ سوءِ اتفاق سے نہ ملی، وکان امر اللہ مفعولا؛

دیوبند کو روانگی

یہ مغرب کا وقت ہے، آج شب کو یہان رہونگا، اور کل علی الصباح انشاء اللہ تعالیٰ سہارنپور روانہ ہوجاؤں گا، مغرب کے بعد میری طبیعت اوکھڑ گئی، اور میں نے ارادہ کرلیا کہ

شب ہی کو سہارنپور کی طرف چلا جاؤں، بھائی جی کے پہنچنے سے پہلے اگر میں دیوبند پہنچ جاؤنگا، تو مدرسہ اور کتب خانہ کی سیر کرسکوں گا، ورنہ وہ اگر روانگی میں بہت عجلت کرین گے، باوجودیکہ میرے میزبان نے بہت اصرار کیا کہ دو چار دن یہاں رہوں، مگر میں نے معذرت کی، اور عجلت کیساتھ کھانا کھا کر اسٹیشن چلا آیا، ان کے بیٹے اسٹیشن تک مجھ کو پہنچانے آئے، میں اس میزبان کا بہت شکر گذار ہون کہ باوجود عدم سابقہ معرفت و باوجود نہ مطلع ہونے معزز خاندانی کے میری ایسی مدارات کی جو آشنایان صورت پرست سے بھی نہیں ہوسکتی، مجھکو ان لوگوں کے حسن ظن پر کمال حیرت ہے، کہ ہر ناقابل کو قابل خیال کر لیتے ہیں، وہ اور ان کی اولاد بچھی جاتی تھی، ان کے بیٹے اسٹیشن تک ساتھ آئے، اور میں دس بجے کی گاڑی پر دیوبند کا ٹکٹ لیکر روانہ ہوگیا، ۱۳؍ کرایہ پڑا، راستہ ہی سے پانی شروع ہوا، اس کے آثار انبالہ ہی میں پائے جاتے تھے، ۲ بجے کے قریب دیوبند پہونچا، مزدور اور یکہ کوئی نہ تھا، وہاں سے سرائے تک اوس تیرہ و تاریک شب میں مینہ برسنے کی حالت میں جو تکلیف ہوئی، وہ ناگفتہ بہ ہے، سرائے میں آکر ٹھہر گیا،

دیوبند کی سرائے

روز پنجشنبہ چہارم شعبان، مینہ کا تار نہیں ٹوٹتا، برابر بارش ہو رہی ہے، اور لطف یہ ہے، کہ اس سرائے میں بیت الخلا نہیں ہے، عام دستور جنگلوں میں جانے کا ہے، میں سخت متحیر ہون کہ اس بارش میں کیونکر باہر جاسکتا ہوں، اور جس غرض سے جلدی کر کے آیا، وہ کیونکر حاصل کروں مگر ناچار سنگ آمد و سخت آمد، کچھ بارش کم ہوئی ہے، موقوف نہیں ہوئی، میں جنگل کی طرف چلا، شہر سے باہر نکلتے ہی مینہ پھر زور سے آگیا، ایک مسجد میں جا بیٹھا، بیٹھے بیٹھے دس بج گئے، اس وقت پھر بارش کم ہوئی، کسی نہ کسی طرح حاجت ضروری سے فارغ ہو کر بہزار خرابی سرائے آکر کھانا کھایا، اب اس وقت بارش نہیں ہے، لیکن ابر و باد کی مہیب شکل ڈرا رہی ہے، ارادہ ہے کہ اب مدرسہ چلا جاؤں، پھر جو کچھ ہو، میں نے جیسے ہی قصد کیا، پھر زور شور سے پانی برسنے لگا، میں سخت حیران ہون،

کہ الہ العالم یہ وقت رائگان ہوتا جاتا ہے، اور جس واسطے میں جلد آیا، وہ بات ہی نہیں حاصل ہوتی، اسی فکر میں بیٹھا تھا، کہ یکہ پر بھیگتے ہوئے بھائی جی چلے آرہے ہیں، انکے آنے سے کچھ طبیعت بٹ گئی، فکر و الم کم ہوا، لیکن شام تک اسی قید میں بسر ہوئی، عصر کے وقت کچھ ترشح کم ہوا، تو میں نے بھائی جی سے کہا، کہ اب آپ تشریف رکھئے، میں مدرسہ دیکھ آؤں، چنانچہ وہ بیٹھے رہے، اور میں مدرسہ گیا،

مدرسہ

چونکہ چار بجے کے بعد گیا تھا، مدرسہ بند ہوگیا تھا، طلبہ موجود تھے، بعضوں سے ملاقات ہوئی، اور عمارت کو دیکھا، اس میں شک نہیں کہ اس مدرسہ کی عمارت بڑے سلیقہ سے بنائی گئی ہے، اس کی صفائی اور ستھرے پن سے مہتمم مدرسہ کا سلیقہ معلوم ہوتا ہے، اس کو دیکھکر واپس ہوا، کیونکہ مینہ کا ترشح پھر شروع ہوگیا تھا، راستے نہایت خراب اور ابتر تھے،

جامع مسجد دیوبند

راستہ میں جامع مسجد کی سیر کی، اس کی بھی عمارت قابل دید ہے، تین درجہ کی مسجد ہے، کسی قدر کرسی بھی ہے، صحن بھی وسیع ہے، صحن میں ایک حوض ہے، جس میں ہر وقت پانی بھرا رہتا ہے، نہایت عمدہ عمارت ہے، مولوی عبد الخالق صاحب کی سعی اور حاجی محمد عابد صاحب کے اہتمام سے بنی ہے، اسکو دیکھکر نہایت افسوس و حسرت کے ساتھ قیام گاہ واپس آیا، رات بھر مینہ برستا رہا، اور مجھکو اپنے اوقات کے ضائع ہونے کا غم رہا،

حاجی محمد عابد صاحب

روز جمعہ پنجم شعبان ۱۳۱۲ھ، صبح کو کسی قدر کھل گیا، بھائی جی اور میں حوائج ضروری سے فارغ ہو کر مدرسہ آئے، مدرسہ جمعہ کی وجہ سے بند تھا، وہاں سے محمد عابد صاحب سے ملنے کے لئے چھتہ والی مسجد آئے، حاجی صاحب نہایت اخلاق بزرگانہ کے ساتھ ملے، ان سے غرض بیان کی گئی، اس کے نسبت دوسرے دن کا وعدہ کیا، یہ بزرگ صالح، اور تکسیر و رقیت میں ماہر ہیں، ارباب حوائج اکثر ان کی خدمت میں آیا کرتے ہیں، صبح سے دس بجے تک نقوش اور تعویذ تقسیم کرتے ہیں، ساکنین

دیوبند انکے بہت معتقد ہیں،

نماز جمعہ میں وعظ ان سے مل کر مولوی محمود حسن صاحب مدرس اول مدرسہ عربیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اتفاق سے مکان پر وہ نہ تھے، وہاں سے قیام گاہ پر واپس آئے، کھانا کھا کر پھر جمعہ کی نماز کے واسطے جامع مسجد آئے، مولوی خلیل احمد صاحب انبٹھوی مدرس دوم مدرسہ عربیہ نے نماز پڑھائی، اوس کے بعد مولوی محمد زکریا صاحب نے وعظ فرمایا، یہ مولوی عبد الخالق صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں، اور مولوی عبد الخالق صاحب مولوی شمس الدین مصنف "شریعت کا لٹھ" (الصدق) کے خلف ہیں، یہاں میں نے ان کو دریافت کیا، معلوم ہوا کہ وہ آج کل سیر و سفر میں ہیں،

سید صاحب کے ایک مرید مولوی شمس الدین صاحب ہمارے حضرت سیدنا[1] کے مرید تھے، ان کے مرید ہونے کا عجیب قصہ ہے، پیشتر یہ نہایت شوقین اور مبتدع تھے، انھوں نے حضرت سیدنا کی ہجو میں کچھ اشعار لکھے تھے، اور اس میں نہایت سخت سُست الفاظ لکھے تھے، جب حضرت سیدنا دیوبند تشریف لائے، اور لوگوں کا ہجوم ہوا، تو ان کے بھی دل میں آیا، کہ جا کر ان کو دیکھیں، اس غرض سے گئے، جب وہاں گئے، اور سلام کیا، تو سید صاحب نے فرمایا آپ کا کیا نام ہے، اونھوں نے عرض کیا شمس الدین، حضرت نے فرمایا وہی شمس الدین جنھوں نے ہماری ہجو میں اشعار لکھے ہیں، سید صاحب نے اس کو تیز آواز میں فرمایا، اور اس ادا سے فرمایا، کہ یہ بیخود ہو کر گر پڑے، اور لوٹنے لگے، سید صاحب باربار یہی فرماتے جاتے تھے، اور ان کی وہی حالت تھی، آخر کو جب انھیں ہوش ہوا، تو انھوں نے بہت معذرت کی، اور مرید ہوئے، اور ایسے مرید ہوئے، کہ سید صاحب کے رنگ میں ڈوب گئے، اور باوجود امتداد زمانہ کے ان کی اولاد میں ابتک ان کا رنگ باقی ہے، میں نے آج ان کے پوتے کا وعظ سنا، اوسی پر تو ہے، جس پر حضرت سیدنا کے عامۂ اصحاب کا مسلک ہے،

[1] حضرت سید احمد شہید بریلوی؛

مولینا محمود حسن وعظ سن کر ہم پھر مولوی محمود حسن صاحب کی خدمت میں گئے، ترشح ہو رہا تھا، مولوی صاحب اپنے مکان کے متصل جو مسجد ہے، اس میں تشریف رکھتے تھے، تعارف کے بعد اسی مسجد میں جلسہ رہا، عصر تک مدرسہ کے ابتدائی حالات اور اب جو نزاع واقع ہو گئی ہے، اسکی کیفیت بیان کرتے رہے،

مدرسہ دیوبند میں ایک پرانا جھگڑا اور مدرسہ کا اصول مختصر یہ ہے کہ اس نزاع کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی، جس وقت مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی، اور اس کی وجہ یہ ہے، کہ بانی مدرسہ جناب مولینا محمد قاسم صاحب مرحوم نے مدرسہ کے جو اصول اس وقت قائم کئے تھے، اور جن پر اب تک عملدرآمد ہے، اون میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے، کہ اربابِ مشورہ میں ہمیشہ صلحا، اور علما منتخب کئے جایا کریں، اربابِ وجاہت کو اس میں ہرگز دخل نہ دیا جائے، اور اس میں مصلحت یہ تھی، کہ ان کو ہمیشہ اپنی بات کی پچ پڑجاتی ہے، اور اختلاف رائے پر بیش از بیش اصرار ہوتا ہے، گو مدرسہ کی بدخواہی ہی کیوں نہ متصور ہو، اس وقت دیوبند میں اکثر اربابِ وجاہت موجود تھے، جن کو اربابِ مشورہ میں منتخب نہیں کیا، باوجودیکہ وہ کبیر السن بھی تھے، ان کو اس بات پر بہت ملال ہوا، لیکن وہ تجربہ کار اور پختہ کار تھے، اس واسطے انھوں نے صریحاً مخالفت کی جرأت نہیں کی، جب ان لوگوں کا انتقال ہو گیا، اور ان لوگوں نے اپنے بعد ناتجربہ کار وارث چھوڑے تو ان لوگوں نے اپنی خام خیالی سے کھلم کھلا مخالفت کرنی شروع کر دی، لیکن خدا کی قدرت سے اب تک کوئی ایسا موقع نہیں ملا جس سے اون کی مطلب برآری ہوتی،

حاجی محمد عابد مہتمم کی معزولی اب سوء اتفاق سے ایک موقع بھی ان کو مل گیا، وہ یہ ہے کہ حاجی محمد عابد صاحب سابق مہتمم مدرسہ کے سفرِ حج کے بعد منشی محمد فضل حق صاحب مہتمم مدرسہ کئے گئے، ان سے دو چار نازیبا حرکتیں ایسی صادر ہوئیں، کہ چار ناچار ان کی اطلاع اربابِ مشورہ کو دینی پڑی، حضرت مولینا مولوی رشید احمد صاحب سرپرست مدرسہ نے حکم دیا کہ یہ موقوف کر دیئے جائیں،

ان سے اربابِ مشورہ نے عرض کیا، کہ ان کے موقوف ہونے سے کوتہ اندیشوں کو دراندازی کا موقع ملے گا، کیونکہ اکثر مخالفین ان کے عزیز ہیں، اور خود ان کو بھی اپنی موقوفی کا رنج ہوگا، مولینا نے پھر مکرر بھی ارشاد فرمایا، کہ یہ موقوف کردیے جائیں، گو تمام عالم مخالف ہوجائے، جب تک مدرسہ کا تعلق ہم لوگوں سے ہے، اس کے ہم ذمہ دار ہیں، کسی بیجا کارروائی کو ہم چھپا نہیں سکتے، پھر مکرر عرض کیا گیا، کہ جو نزاع برپا ہوگی، اس سے مدرسہ کو مضرت پہونچنے کا اندیشہ ہے، کیا عجب ہو کہ مدرسہ ٹوٹ جائے، مولینا نے فرمایا کہ مدرسہ خدا کی رضامندی کے واسطے کیا گیا ہے، اور جو کچھ ہم کررہے ہیں، اسی کے واسطے ہے اگر اسی کے ہم گناہ گار ہوکر اس کو انجام دیں تو کون سے ثواب کی بات ہے، جب تک اس کی رضامندی کے موافق کام ہوسکے، اس وقت تک کریں گے، ورنہ چھوڑ دیں گے، جب باوجود اصرار کے مولانا اس پر مصر رہے تو سب چپ ہوگئے، لیکن اس بارہ میں سب متزلزل الرائے تھے، مولینا نے فرمایا کہ تم سے نہیں ہوسکتا، تو ان کو ہمارے پاس بھیجدو، ہم سمجھا دیں گے، لوگوں نے بھی اس کو مناسب سمجھا، اور خود منشی نضل حق صاحب نے بھی جب اس قسم کے تذکرے سنے، تو لوگوں سے رائے پوچھی، سب نے بالاتفاق یہ رائے دی، کہ حضرت مولوی رشید احمد صاحب سے مل لیجئے، جیا ان کے خیال میں ہو اوس پر عمل کرنا بہتر ہے، وہ بھی مولینا کے بہت معتقد تھے، گنگوہ چلے گئے، مولانا نے ان سے فرمایا کہ تمھاری نسبت عموماً لوگون کے ایسے خیالات ہیں، بہتر ہے کہ تم استعفا دیدو، کیونکہ اس میں مدرسہ کی خیرخواہی ہے، انھون نے ملازمت کی وجہ سے کچھ پس و پیش کیا، لیکن مولینا نے فرمایا کہ نوکری کا کچھ پس و پیش نہ کرو، تمھاری نوکری ہوجائیگی، اس کے بعد مولینا نے بہت نصیحت کی کہ بعد استعفا دینے کے تم اور کچھ خیال کرنا، جیسے اب تک ہواخواہ رہے، ویسے ہی ہمیشہ خیرخواہ رہنا اس میں تمھارے واسطے بہتری ہے، وہ یہ سب کچھ سن کر وہاں سے آئے اور طوعاً و کرہاً انھوں نے استعفا پیش کیا، اور وہ استعفا منظور بھی ہوگیا،

مخالفین کی کوششیں

اس کے بعد ان مخالفین کوتہ اندیشوں نے ان کو برانگیختہ کرنا شروع کیا آخرالامر ان لوگوں نے اس کو مبنی علیہ فساد کا قرار دیکر جو باتیں نہ کرنے کی تھیں، وہ بھی شروع کردیں، خط پر خط مولینا کی خدمت میں نہایت سخت و سست الفاظ کے لکھ لکھ کر روانہ کئے، اور بہت کچھ ڈرایا دھمکایا، لیکن مولینا نے ان سب خطوں کا صرف یہ جواب دیا، کہ تم ہم سے انتزاع کرنے کے مجاز نہیں ہو، ہم چندہ دینے والون کے وکیل ہیں، اگر ان کو ہم سے کچھ پوچھنا ہو تو ہم اس کے جواب دہ ہیں، تمھارا جی چاہے تو ان لوگوں سے کہو وہ ہم سے جو پوچھیں گے، ہم اس کا جواب باصواب دین گے، جب انھوں نے یہ تدبیر کارگر نہ دیکھی، تو ایک اشتہار چھپوایا، جس میں نہایت صاف صاف اربابِ مشورہ کے نسبت سخت سُست الفاظ لکھے تھے، اور مولینا سلمہم اللہ تعالیٰ کو منہ پھوڑ کر گالیاں دی تھیں، جس کے دیکھنے اور سننے کے ارادتمند متحمل نہیں ہوسکتے، اور جو کچھ بددیانتی، اور بے ضابطگی اون کے زعم باطل میں تھیں، وہ سب لکھ دین، اور ایک تاریخ مقرر کی، جس میں چندہ دینے والے آکر مدرسہ کا جائزہ لین اور اپنے مدرسہ کی حقیقۃ الحال کو سمجھیں، اس کی پانسو کاپیان چھپوا کر تمام چندہ دینے والوں کے پاس بھیجدین، جس سے تمام متعلقین مدرسہ کو نہایت اضطراب پیدا ہوا، اس کی بھی اطلاع مکرر حضرت مولینا مدظلہ کی خدمت میں کی گئی، مولانا نے فرمایا، کہ ان کی خاک اوڑانے سے کچھ نہیں ہونے کا، اول تو وہ لوگ آئیں گے نہیں، اگر آئیں تو بسم اللہ چشم ما روشن دل ما شاد، اپنے مدرسہ کا حساب و کتاب سمجھیں، جب تک تمھارا تعلق ہے، اوس وقت تک تم اپنے فرض منصبی کو نہایت اطمینان سے پورا کرتے رہو، اس میں غفلت نہ ہونے پائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، کہ کوئی آیا نہیں، وہ لوگ کئی روز تک برابر اسٹیشن استقبال کو جایا کئے، اور جو آئے بھی وہ سیدھے مدرسہ میں آئے، دو چار دن رہکر دیکھ بھال کر چلے گئے،

مولینا گنگوہی پر الزام بغاوت

جب اس سے بھی وہ عاجز ہوئے، تو انھوں نے گورنمنٹ کی خدمت

میں استدعا کی، کہ یہ مدرسہ نہایت خراب اصول پر چل رہا ہے، ان لوگوں کے خیالات بغاوت آمیز ہیں، اسی واسطے مدرسہ میں ولایتی کثرت سے رکھے گئے ہیں، اور ایک زمانہ میں مولوی رشید احمد نے تھانہ بھون کی بغاوت میں شرکت کی تھی[1]، یہ ہمیشہ کے باغی ہیں، ان کی نسل نکالی جاوے، بہتر تو یہ ہے کہ اس مدرسہ کو گورنمنٹ اپنے ہاتھوں میں لے، اور اگر یہ منظور نہ ہو تو حاجی محمد عابد صاحب اس کے سرپرست مقرر کئے جائیں، جن کو جشن جوبلی میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا ہے، اس اشتہار کے چھپنے پر ہواخواہان حضرت مولینا سلمہم اللہ تعالیٰ کو نہایت تشویش پیدا ہوئی، لیکن مولینا ذنسب کو کمال استقلال کے ساتھ تسلی دی، کہ اب ہمارا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا ہے، اگر منظور الٰہی یہی ہے، تو بہتر ہے، ہم کیوں مرتے مرتے اس ذمہ داری کے کام کا مواخذہ لیجائیں، اور اصل تو یہ ہے کہ ان کے کرنے سے کچھ نہ ہوگا، جب خدا نے اس وقت ہم کو محفوظ رکھا، تو اب بھی محفوظ رکھے گا، اسی طور پر وہ لوگ خاک اڑا رہے ہیں، اب بھی ایک شخص دہلی دوسرے مضمون کا اشتہار چھپوانے گیا ہے، اور خدا کی عنایت یہ ہے کہ کسی مسلمان نے ایسے از سرتاپا حیلہ انگیز اشتہار کا چھاپنا پسند نہیں کیا، ایک ہندو منیجر مطبع نے چھاپا ہے، اسی ہفتہ میں کلکٹر ضلع مدرسہ کے معاینہ کو آیا، اور اس نے مدرسہ کے ہر ہر مکان کو ملاحظہ کیا، طالب علموں سے ان کی سکونت دریافت کی، انھوں نے اپنے اپنے مکان بیان کئے، چلتے وقت معائنہ کی کتاب میں مدرسہ کی نہایت تعریف لکھی، جس کی امید نہ تھی، بہرحال بفضل خدا مدرسہ کی ترقی روز افزون ہے، اور ان لوگوں کی حالت بھی ترقی پذیر ہے،

ابھی تک ادھر سے کوئی جواب ترکی بترکی نہیں دیا گیا، میری رائے میں اگر اس پمفلٹ طاہر لائبل کیس کر دیا جائے، تو ان کی حقیقت کھل جائے، مگر چونکہ یہ لوگ نہایت متحمل اور بردبار ہیں اب تک کسی نے خیال نہیں کیا، یہ سب باتیں ہوتی رہیں، اور مینہ لگاتار برستا رہا، ویں عصر کی نماز

[1] ۱۸۵۷ء میں،

پڑھی، نماز کے بعد بارش کا سلسلہ موقوف ہوا، تو ہم نے اجازت چاہی لیکن مولوی محمود حسن صاحب نے نہایت اصرار سے اس بات پر زور دیا کہ اون کے مکان پر ہم اوٹھ آئیں، اور نہایت تعجب کے ساتھ شکایت کی، کہ آپ کا سرائے میں ٹھہرنا محل تعجب ہے، مگر چونکہ اسباب ہمارے ساتھ ہے، اور کالے خان نے کھانے وغیرہ کا وہاں انتظام کر لیا ہے، اس وقت بھی تیار ہو رہا ہے، اس وجہ سے وہاں اٹھ جانے کی رائے نہ ہوئی، مولوی صاحب کا اصرار بڑھتا گیا، اور ہماری معذرت، آخر کو رائے اس پر قرار پائی، کہ کل دن کو کھانا مولوی صاحب کے یہاں کھائیں، اسی قرارداد پر ہم رخصت ہوئے، رات بھر سرائے میں رہے، مینہ برستا رہا،

(باقی)

الفاروق

یعنی حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت، صحابہ کے فتوحات، طریقہ حکومت، عراق و شام مصر اور ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق و زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر،

مولینا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گراں پایہ کتاب کے بیسیوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت، اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائٹل، ضخامت ۲۱۲ صفحے، قیمت سے،

"منیجر"

مغالطۂ تحلیل

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب ایم اے لکچرار فلسفہ، گورنمنٹ کالج، گجرات، پنجاب،

(۳)

(ب) اب کائنات کا وہ حصہ لیجئے، جس کے موجودات ذی حیات ہیں، اور جس کے اجسام آلیہ ہیں، اجسام آلیہ، اور غیر آلیہ (یعنی غیر ذی حیات) کا اختلاف اس مثال سے فوراً ذہن نشین ہوجائے گا، میری گھڑی ٹوٹ گئی ہے، لیکن اس کا ایک پرزہ بالکل صحیح وسالم ہے تو یہ ٹکڑا آپ کی گھڑی میں، اگر وہ اسی طرز کی ہے، جیسی کہ میری تھی، استعمال ہوسکتا ہے، دونوں گھڑیاں موجوداتِ غیر ذی حیات (یعنی غیر آلیہ) ہیں، لیکن اگر میری یا آپ کی ٹانگ خدانخواستہ کٹ جائے، تو کیا ایسے ہی قد وقامت کے کسی ہمسایہ کی ٹانگ مستعار لیجا سکتی ہے،؟ اور اگر وہ دے بھی دے، تو کیا ہمارے جسم کیساتھ اس ہمسایہ کی ٹانگ کا زندہ جوڑ ممکن ہے،؟ اجسام آلیہ اور غیر آلیہ میں یہی اہم فرق حد فاصل ہے، جسم غیر آلیہ کا ایک جزو دوسرے جسم غیر آلیہ میں استعمال ہوسکتا ہے، لیکن جسم آلیہ کا کوئی عضو اگر اس جسم سے علٰحدہ ہوجائے، تو وہ عضو زندہ نہیں رہتا، اور نہ اس کا زندہ جوڑ دوسرے جسم آلیہ کیساتھ ہوسکتا ہے،

اب کیا سائنس کا تحلیلی اور ترکیبی طریق کار جو عالم غیر ذی حیات میں اس قدر مفید ثابت ہوا ہے، اجسام آلیہ (ذی حیات) کی دنیا میں بھی اسی طرح مفید اور سیر حاصل ہے،؟ کیا حیات، ذہن، شعور اور جماعت کے مختلف اور لاتعداد مسائل پر یہ طریق کار اسی طرح روشنی ڈالتا ہے، جیسے کہ اجسام غیر آلیہ کے فہم وادراک پر،؟

اجسام آلیہ میں نہ تو مکمل تحلیل ممکن ہے (کیونکہ حیات کا عنصر تو عمل تحلیل سے مفقود ہوجاتا ہے) اور نہ صحیح ومکمل ترکیب ہی آسان ہے، پھر ان اجسام میں ایک کثیر تعداد ان کی ہے، جن میں حیات کے علاوہ ذہنی اور نفسی کیفیتیں بھی موجود ہیں، جن کی کلی تخیلی تحلیل تو کسی حد تک ممکن ہے، لیکن جن کی مکمل تخیلی ترکیب (اور ایسی ترکیب کے نتائج کا صحیح اندازہ کرنا) قریباً ناممکن ہے، ایسے موجودات کے مطالعہ کیلئے سائنس کا تحلیلی وترکیبی طریق کار بہت حد تک ناکام رہا ہے، یہ موجودات ان علوم سے متعلق ہیں جنھیں ہم حیاتیات اور انسانیات[۱] کے وسیع عنوانات دیسکتے ہیں،

غور فرمائیے، علوم طبیعیات اور کیمیا کی محققانہ دقیق اور صحیح نتائج انکشافات واختراعات اور ایجادات کے مقابلہ میں حیاتیات اور انسانیات کے نتائج اور تحقیقات کس قدر مشروط اور غیر یقینی ہیں، ان علوم میں تو ابھی علماء کا اجماع ان کے تمام ابتدائی مسائل پر بھی نہیں ہوا ایک ہی علم کے محققین، طریق کار، مسائل اور مقاصد کے معاملہ میں مختلف اور متضاد گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، مثلاً حیاتیات میں میکانیئین[۲] اور عضویئین[۳] کا باہمی تضاد نظر شاید اصولی اور ناقابل حل ہے،

نفسیات میں کئی مذاہب ہیں، اور ہر ایک مذہب دوسرے کو اصحاب مغالطہ بتاتا ہے، کوئی شعور کے معاینہ پر مصر ہے، اور بغیر اس کے نفسیات کو ناممکن قرار دیتا ہے، کوئی عمل کے معاینہ کو اشد ضروری سمجھتا ہے، اور شعوریئین[۴] کو ایک مصنوعی، بے حقیقت اور خود ساختہ خیالی دنیا، کا باشندہ قرار دیتا ہے کوئی

---

[۱] Humanistic SCIENCES [۲] میکانیئین (Mechanists) سے مراد وہ علماے حیاتیات ہیں، جن کا عقیدہ ہے کہ عنصر حیات سفیدہ سلول کے کیمیاوی اور طبعی اجزاء کے علاوہ کوئی شے نہیں ہے، [۳] عضویئین (Vitalists) سے مراد وہ علماے حیاتیات ہیں، جو عنصر حیات کو کیمیاوی اور طبعی اجزاء سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں اور اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ سفیدہ سلول کی کیمیاوی تحلیل سے عنصر حیات کا عقدہ حل نہیں ہوسکتا، [۴] Behaviour [۵] INTROSPECTIONIST

نفسی طبیعیات[۱] کو نفسیاتی نتائج کی صحت کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے، کوئی نفسی تحلیل[۲] کو نفسیات کی جان تصور کرتا ہے، کوئی نفسیاتی احصائیہ[۳] پر مصر ہے، اور کوئی پیمائش فراست[۴] پر، الغرض یہ اصولی اختلافات ہیں، جو طالب علم کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں،

اخلاقیات کی حالت اس سے بھی بری ہے، اس کے متعلق ابھی یہ بھی فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ اخلاق کا فلسفہ ہے یا خیر کا علم، اس کا تعلق انسانِ فاعل سے ہے، یا انسان کے فعل سے، یا اس نتیجہ سے جو اس فعل سے صادر ہوا،

سیاسیات اور معاشیات درحقیقت اس معنی میں علوم ہیں ہی نہیں، جس مفہوم میں طبیعیات اور کیمیا علوم ہیں، ان علوم میں مادہ اور اسکی مختلف حالتوں کو کمیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور نتائج کی صحت کا سب سے بہتر اور صحیح معیار یہ سمجھا جاتا ہے، کہ انھیں دوسرے سائنس داں بھی اپنی اپنی کارگاہوں میں پرکھ سکیں، نتیجہ میں کمیت کی ذرہ برابر کمی بیشی بھی اس نتیجہ کی عدم صحت پر دال ہوتی ہے، لیکن سیاسیات اور معاشیات میں یہ دقتِ نظر اور صحتِ نتائج قریب قریب ناممکن ہے، ان علوم میں تو ابھی نہ طریق کار کے متعلق اتفاق ہے، اور نہ نصب العین اور مبحثِ فکر کے متعلق، آج کل تو ہر قوم، ہر ملک بلکہ ہر ملک و قوم کے ہر سیاسی حزب کا اپنا اپنا مخصوص طریق کار، مبحثِ فکر اور نصب العین ہے، ہر سیاسی حزب اپنے ان نظریوں کو نہ صرف تشدد سے دوسروں کے سامنے پیش کر رہا ہے، بلکہ وہ اس کوشش میں رہتا ہے، کہ ہو سکے تو بزورِ شمشیر تمام دنیا کو ان نظریوں پر عمل پیرا کرے، سچ تو یہ ہے کہ سیاسیات اور معاشیات میں (اور ان میں علوم مدنی کی باقی ماندہ مثالیں شامل کر لینی چاہئیں،) منطق کا مشہور

۱ Psycho physics ۲ Psycho analysis

۳ mental statistics

۴ measurement of Intelligence

مغالطہ دلیل عصائی[۱]، برہان قاطع کے طور پر استعمال ہو رہا ہے،

ہم نے سطور بالا میں علوم انسانیات کے مشہور و معروف شعبوں کو درج کر کے عرض کیا ہے کہ ان علوم کی ارتقائی حالت تسلی بخش نہیں ہے، نہ ان میں طریق کار کی یگانگت ہے، نہ نصب العین کی یکسوئی، نہ ان میں کیفیت کے لحاظ سے یکرنگی ہے، نہ کمیت کے لحاظ سے درستی و صحت نتائج، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے، کہ ان علوم میں کچھ کام نہیں ہو رہا ہے، یا ان علوم کے متوالوں کی تعداد تھوڑی ہے، کام بہت ہو رہا ہے، اور بہترین کارکن کثیر تعداد میں مصروفِ کار ہیں، لیکن ان کے کام کی اصولی بے مائیگی اور بے حاصلی (کمیت کے لحاظ سے یا نتائج کی بے ترتیبی) درحقیقت اس امر کو واضح کر رہی ہیں، کہ یہ علوم اپنی نوعیت اور ساخت میں ان علوم سے بالکل مختلف ہیں، جن کا موضوعِ بحث و کار مادۂ غیر ذی حیات ہے، وہاں طریقۂ تحلیل بہت کام دیتا ہے، لیکن ان علوم میں بجائے فائدہ مند ہونے کے وہ گمراہ کرتا ہے، انسانی نفس دل و دماغ معاشرت، سیاست اور اخلاق، وغیرہ اس قدر پیچیدہ مسائل پیدا کرتے ہیں، کہ ان کی صحیح صحیح تحلیل کر لینا عملی طور پر اگر ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے، اور اگر صحیح تحلیل ہو بھی جائے، تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے، کہ تحلیل نے جو اجزا ہمارے ہاتھ میں دئے ہیں، ان کے جوڑ توڑ سے یا انھیں نئے طریقوں سے ملا کر ہم اپنے ان مسائل کے متعلق کارآمد نظریے اور طریق کار دریافت کر سکیں گے، نفسیاتِ جماعت کی صرف ایک مثال لیجئے، زید اگر طبعاً بزدل ہے، تو اغلب ہے کہ بہادروں کی فوج میں بھرتی ہو کر اور ان کے شجاعانہ کارناموں سے متاثر ہو کر وہ بھی بہادرانہ کام کر ڈالے، بکر اگر طبعاً بہادر ہے، تو اغلب ہے کہ بزدلوں کے گروہ میں شامل ہو کر اور انھیں بھاگتا ہوا دیکھ کر وہ بھی بھاگ جائے، اس سے ظاہر ہوا کہ وہی شخص جو طبعاً ایک طرح کی خاصیت اپنے اندر رکھتا ہے، جب وہ کسی جماعت یا گروہ میں شامل ہوگا، تو اسکی نفسی حالت یا طبیعت میں غیر معمولی فرق

۱ یعنی اگر مخالف یا معترض آپ کا قول نہ مانے تو اس کا سر پھوڑ دیجئے،

آجائیگا، اب کیا ہم زید و بکر کی نفسی تحلیل سے ان نتائج تک پہونچ سکتے ہیں ؟ ہرگز نہیں، ہمیں یہ نتیجہ صرف مشاہدہ سے معلوم ہو سکتا ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ علوم انسانیات میں، بلکہ ان تمام علوم میں جن کا موضوع فکر مادۂ ذی حیات ہے طریقۂ تحلیل نہ صرف بالعموم بے حاصل ہوتا ہے، بلکہ اکثر اوقات گمراہ کن بھی ہوتا ہے، کم از کم ہم کسی صورت میں بھی ان علوم میں تحلیل کے نتائج پر قانع نہیں رہ سکتے،

۱۰۔ کیا علوم انسانیات میں طریقہ ترکیب ہماری مشکلات کو حل کر دیتا ہے، ؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نہیں، ان علوم میں طریقہ ترکیب کے استعمال کی بہترین شکل وہ ہے، جسے طریقۂ عملی[1] کہتے ہیں، یعنی اگر ہم کو یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمارا فلان فلان نظریہ صحیح ہے، یا نہیں تو ہمیں چاہئے کہ اسے بہترین شکل و حالات میں عمل میں لائیں، اور دیکھیں کہ اس کے عملی نتائج کیا ہیں، اگر یہ عملی نتائج تسلی بخش ہیں، تو نظریہ صحیح ہے اور اگر غیر تسلی بخش ہیں، تو نظریہ غلط ہے، اور اسے بدلنا چاہئے، تسلی بخش اور غیر تسلی بخش ہونے کا معیار کیا ہے، ؟ یہ معیار کوئی مستقل شے نہیں، ہمیں اپنی وقتی ضروریات کی روشنی میں فیصلہ کرنا پڑے گا،

اس طریقۂ عملی میں بہت سے فوائد ہیں، سب سے بہتر فائدہ یہ ہے، کہ ہم اپنے نظریہ کو عملی طور پر پرکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ وہ صحیح ہے، یا نہیں، اگر نتائج تسلی بخش نہیں ہیں، تو ہم اپنے نظریہ کو بدل سکتے ہیں،

اب ذرا اس طریقہ کار کو بغور دیکھئے، فرض کیجئے کہ ہمیں اپنی معاشرت میں چند نقائص کو دور کرنا ہے تو ہم پہلے پہل تو حتی المقدور تمام حالات کا مطالعہ کرتے ہین اور ماحول کا مفصل جائزہ لیتے ہین، اور جن مختلف محرکات کو ملت میں برسر کار دیکھتے ہیں، ان کی پھر (حتی المقدور) تحلیل کرتے ہیں، اس کے بعد ہم اندازہ کرتے ہین، کہ ان محرکات میں فلان فلان کو اگر گھٹا دیا جائے اور فلاں فلاں کو اگر بڑھا دیا جائے، تو امید ہے کہ یہ نقائص دور ہو جائیں گے، چنانچہ ملت کے بہترین دماغ کوئی نظریہ اختراع کرتے ہیں، اور

[1] THE PRAGMATIC METHOD

اسے قانون کی شکل دیکر رائج کرتے ہیں، اگر اس قانون سے کچھ مدت کے بعد، وہ نقائص دور ہو جائیں تو گویا ہمارا نظریہ صحیح ثابت ہوا، اور نظریہ کی اختراع سے پہلے ہم نے جو تحلیل محرکات کی تھی، وہ بھی صحیح ثابت ہوئی، لیکن اگر اس نئے قانون کے باوجود وہ نقائص دور نہ ہوں، بلکہ چند اور نقائص بھی پیدا ہو جائیں، تو کیا ہوگا ؟ کیا ہم صرف یہ کہیں گے، کہ کچھ پرواہ نہیں، دوبارہ محرکات کی تحلیل کرکے بہترین نظریئے و قانون بنائیں، کیا ملت کا فرض صرف اس طرح سے دور ہو جاتا ہے، ؟ کیا پچھلے ناقص نظریہ اور قانون کی وجہ سے ہم نے ملت میں نئے امراض داخل نہیں کر دیئے، ؟ ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جنھیں ہمارے نظریہ اور قانون کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا ہے، کیا افراد ملت اب ہمارے نئے قانون کیلئے تختہ مشق بننے کو تیار ہیں، ؟

اس مثال سے علوم کیمیا و طبعیات، اور علوم انسانیات میں جو بعد المشرقین ہے ظاہر ہو جائیگا، علوم کیمیا و طبعیات میں آپ نظریہ قائم کرتے ہیں، اور اپنی کارگاہ میں مختلف کیمیاوی مسالے اور طبعی آلات کی مدد سے تجربے کرتے ہیں، اور اپنے نظریہ کی صحت کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں، آپ کا تجربہ اگر نظریہ کو غلط ثابت کرتا ہے، تو آپ فرماتے ہیں، چلو کیا ہوا، نیا نظریہ اختراع کرو، دوبارہ تجربہ کر لو، صرف چند روپیوں کا نقصان ہوا، اور کچھ وقت ضائع ہوا ہے، اور بس، لیکن جب آپ ایک سیاسی یا معاشرتی تجربہ پوری قوم و ملت پر کرتے ہیں، تو آپ کے اوپر ایک ایسی ہی ہمت شکن اور صبر آزما آزمایش ڈال دی جاتی ہے جیسی کہ حضرت انسان پر روز ازل میں ڈال دی گئی تھی، جبکہ بڑے بڑے پہاڑوں نے ہمت ہار دی تھی اب اگر آپ کا وہ نظریہ غلط ثابت ہو جائے، تو آپ نے نہ صرف کروڑوں روپیوں کا نقصان کیا، بلکہ قوم و ملک کے لاکھوں کروڑوں افراد کو بھی مصیبت میں مبتلا کر دیا،

متذکرۂ بالا بحث سے ظاہر ہوا کہ علوم کیمیا اور طبعیات، دونوں یا تو نہیں خوش قسمت

ہیں، ان میں تحلیل بھی آسان ہے اور ترکیب بھی آسان، وہ نت نئے نظریے بناتے ہیں، سیکڑوں نظریوں کو غلط دیکھ کر پھینک دیتے ہیں، اور نہایت اطمینانِ قلب سے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں، ان علوم کے لئے نظری اور عملی طریقے دونوں موجود ہیں، اور دونوں سے یہ علوم سیر حاصل ہیں، لیکن علوم انسانیات میں (اور ان تمام علوم میں بھی جن کا کسی نہ کسی شکل میں مادہ ذی حیات سے تعلق ہے) تحلیل مشکل بھی ہوتی ہے، اور بالعموم نامکمل بھی، اسی طرح ترکیب بھی اکثر اوقات مشکل اور بعض حالتوں میں ناممکن ہوتی ہے،

۱۱۔ الغرض طریقۂ تحلیل علوم کیمیا وطبعیات میں تو نہایت کامیاب رہا ہے، لیکن علوم حیاتیات اور انسانیات میں بعض حالتوں میں بالکل ناقابل استعمال اور بالعموم نامکمل، ناقص اور ناکامیاب رہا ہے، ان علوم کے لئے تحلیل اور ترکیب کی ایک مجموعی صورت کا نام طریقۂ عملی ہے، (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) اس طریقے سے اوّل تو ان حوادث اور حالات کے ظاہری اور خفیہ محرکات کی حتی المقدور مکمل تحلیل کیجاتی ہے، (یا کم از کم اس امر کی کوشش کیجاتی ہے) اور پھر اس تحلیل سے حاصل کئے ہوئے اجزا کے مطالعہ سے نیا نظریہ بنایا جاتا ہے، جس سے ان حیاتی، نفسی، اخلاقی، معاشرتی یا سیاسی حوادث کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے اور ان کے شر سے (اگر وہ شر انگیز ہیں) کسی متنفس کو، یا کسی ذی شعور انسان کو، یا انسانوں کی کسی جماعت کو بچانے کی امید کیجا سکتی ہے، اگر وہ حادثہ جس کی تحلیل کی گئی ہے، جماعت سے متعلق ہے، تو اس نظریہ کو جو تحلیل کے بعد بنایا گیا ہے، قانون کی شکل دیکر ملت کی بہبود کے لئے رائج کیا جاتا ہے، اگر اس کے رائج کرنے کے بعد وہ شر اس جماعت سے دور ہو جائے تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، کہ محرکات کی تحلیل صحیح تھی، اور جو نظریہ اس تحلیل کے اجزا کو نئے طریقوں سے مرکب کر کے ہم نے اختراع کیا تھا، وہ بھی صحیح تھا اگر شر دور نہ ہو، بلکہ اسی شدت سے قائم رہے یا اور نئے نقائص ملت کے اندر پیدا ہو جائیں تو ہمیں ماننا پڑے گا، کہ یا تو تحلیل غلط تھی، یا نظر

غلط تھا، اور یا دونوں غلط تھے، ایسی حالت میں تحلیل پر نظر ثانی کرنا پڑے گی، اور نئے نظریہ کا انتظار ہوگا، لیکن افسوس یہ ہے کہ علوم انسانیات کے مطالعہ کے لئے اور انسانی جماعتوں کی واقعی بیماریوں کے انسداد کیلئے یہ عملی اور تجربی طریقہ نہ صرف اکثر اوقات کارگر نہیں ہوتا، بلکہ بعض حالتوں میں سخت نقصان دہ بھی ہوتا ہے، اور اس کے وجوہ یہ ہیں:-

ا۔ انسانی حس، فکر اور فعل مادہ نہیں ہیں، کہ ان کی تحلیل آسانی سے ہو سکے، نفسی اور شعوری حالتیں اس قدر نازک، دقیق، حرکی، اور (بعض اوقات) فوری ہوتی ہیں، کہ جہاں تحلیل کا خیال بھی ذہن میں آیا، تو وہ حالت جس کی تحلیل منظور تھی، کافور ہو گئی، مثلاً نفسیات کا ہر متعلم جانتا ہے، کہ اگر وہ غصہ کی حالت میں اپنی نفسی تحلیل کی کوشش کریگا، تو غصہ فوراً دور ہو جائے گا، یہی حال دوسرے جذبات اور محسوسات کا بھی ہے، "فکر" اور فعل کی نفسی تحلیل ہو سکتی ہے، لیکن قدم قدم پر مغالطہ کا خطرہ رہتا ہے، نفسی حالتیں ناقابلِ وزن ہیں، ان کی کیفیت کا اندازہ آسان ہے، لیکن ان کی کمیت اور شدت کا اندازہ ذاتی مشاہدہ پر منحصر ہے، الفاظ اسے پوری طرح بیان کر نہیں سکتے، مثلاً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آپ سے ملکر خوشی حاصل ہوتی ہے، لیکن میں یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ خوشی اس خوشی سے پوری دوگنا زیادہ ہے، جو مجھے فلاں شخص کے ملنے سے حاصل ہوئی تھی،

(ب) دوسری وجہ کہ انسانیات میں طریقۂ عملی نقصان دہ کیوں ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ افراد اور اقوام کی عملی زندگیوں میں جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، ان کے نتائج صرف ان افراد تک (یعنی ان اقوام کے ان افراد تک جو اس وقت موجود تھے) محدود نہیں رہتے، بلکہ وہ قدم قدم پر بڑھتے جاتے ہیں، اور اپنی لپیٹ میں ان افراد اور نسلوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں، جن کا اس پہلی غلطی سے نہ کوئی واسطہ تھا اور نہ وہ اس کے ذمہ دار تھے، پھر جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، اس غلطی کے نقصانات کی شدت بھی بڑھتی جاتی ہے، یہ حالت ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے کسی خطرناک مقارمتی

بیماری میں مبتلا ہو جائے، اور پھر وہی بیماری اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو بطور وراثت دیجائے، اس کے بعد اس کے بچے اس بیماری کو اپنے بچوں تک پہنچائیں، اور یہ خطرناک سلسلہ برابر بڑھتا جائے اگر اس غلطی کا پہلا نتیجہ ایک تھا، تو دوسرا دوگنا، تیسرا چارگنا، چوتھا آٹھ گنا، پانچواں سولہ گنا ہوگا، اگر نقصان کی رفتار و شدت اسی ہندسی تصاعد؎ سے جاری رہے، تو بھی غنیمت ہوگا، ورنہ کوئی تعجب نہیں، کہ اگر نقصان کا پہلا درجۂ شدت ایک تھا، تو دوسرا دس گنا زیادہ ہو جائے، اخلاقی معاشرتی اور سیاسی دنیا میں جو شخص گناہ کرتا ہے، وہ خود نقصان میں مبتلا ہوتا ہے، دوسروں کو مبتلا کرتا ہے؎، اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے ایک غلط اور بُری راہ نکال جاتا ہے،

ج - اخلاقی سیاسی اور معاشرتی بیماریوں کے لئے جو بہترین نسخہ بھی ان علوم کے ماہرین عملی و تجربی طریقوں سے تیار کریں گے، اسکے متعلق ہم یقینی طور پر صرف یہ کہہ سکیں گے، کہ مستقبل قریب میں اغلب ہے، کہ اس کے استعمال سے وہ نقائص دور ہو جائیں جنھیں دور کرنے کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا گیا ہے، لیکن "مستقبل بعید" میں اس نسخہ کے استعمال کے کیا کیا مفید یا مضر حوادث ظاہر ہوں گے، ان کے متعلق کچھ کہا نہیں جاسکتا، اب "مستقبل قریب" تو قوم و نسل کی جماعتی زندگی میں ایک دن کی حیثیت بھی نہیں رکھتا، اسلئے نتیجہ یہی نکلا کہ علوم انسانیات میں طریقۂ عملی و تجربی کا بہترین تیار کردہ نسخہ بھی اپنے اندر "مستقبل قریب" کے متعلق صرف چند مشروط فوائد رکھتا ہے، اور کوئی تعجب نہیں کہ ان فوری فوائد کے بعد اس قوم کے انہی افراد کو اسی نسخہ سے نقصان زیادہ پہونچے اور فائدہ کم، بعد میں آنیوالی نسلوں کے متعلق حکم لگانا، ناممکن ہے، کیونکہ ایسا کرنا مغالطہ میں پڑنا ہے،

۱۲ - فصل نمبر ۲ میں ہم نے جو چار سوال پیش نظر رکھے تھے، ان کا مفصل جواب اوپر گذر چکا ہے،

؎ Geometrical progression ؎۲ وجہ یہ ہے کہ اگر دنیا میں صرف ایک انسان موجود ہو تو کوئی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی گناہ (برائی) ہو ہی نہیں سکتی،

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ

۱ - مغالطہ تحلیلی "مغالطہ" اسلئے ہے کہ اس کا کلیدی قانون (ا = ج + د) بالکل غلط ہے، ہم نے دیکھا ہے، کہ اگر کسی وجود کے خواص یا اجزاء کے خارج کر دینے سے وہ وجود معدوم ہو جائے، تو بھی یہ کہنا غلط ہے، کہ وہ وجود محض مجموعہ ہے اپنے اُن خواص یا اجزاء کا،

۲ - تحلیل ہر حالت میں مغالطہ نہیں ہے، مغالطہ وہ صرف اسی وقت بنتی ہے، جب وہ ترکیب کے حقوق کو غصب کرتی ہے،

۳ - علوم کیمیا و طبیعیات میں تحلیل نہایت مفید اور سیر حاصل رہی ہے، ان ہی علوم میں ترکیب بھی آسان ہے، تحلیل و ترکیب کی باہمی کوشش سے یہ علوم اپنے بلند پایہ تک پہونچے ہیں، تحلیل محض ان علوم میں ہرگز زیادہ مفید نہ ہوتی،

۴ - حیاتیات اور انسانیات کے جملہ علوم میں تحلیل محض بالکل ناکافی، نامکمل، مضر اور گمراہ کن ہوتی ہے، ان علوم میں عمل ترکیب بھی مشکل ہے اور تحلیل و ترکیب کا اشتراک عمل بھی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان علوم میں وہ پختگی، یک سوئی، صحت نتائج اور سیر حاصلی موجود نہیں ہے جو علم کیمیا و طبیعیات کا آجکل طغرائے امتیاز بنی ہوئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان علوم کو تحلیل و ترکیب کے طریقوں کے علاوہ کوئی نیا طریقہ کا اختراع کرنا پڑے گا،

مبادی فلسفہ جلد اول

یہ مولوی عبدالماجد صاحب بی اے کے مختلف فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ ہے جن کی تعداد ۹ ہے، مضامین دلچسپ اور ان کا طرز بیان رواں و شگفتہ ہے، ۱۸۵ صفحے، قیمت: ۱عہ

منیجر

جواہر الاسرار

میں

کبیر کی بات چیت

جالندھر میں ایک دوست (حکیم عبدالعزیز صاحب مشرقی) کے پاس اون کے بزرگوں کی امانت اور وراثت تصوف کی قلمی فارسی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ ہے، اس میں ایک فارسی کتاب جواہر الاسرار نام نظر سے گذری مصنف کا نام اور تصنیف کی تاریخ مذکور نہیں، رسالہ کے ساتھ خلاصۃ العارفین وغیرہ حضرت زکریا ملتانی، حضرت فریدالدین گنج شکر، حضرت جلال بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کے ملفوظات ہیں، اسی مجموعہ میں فارسی میں گیتا کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس کے آخر میں کتابت کی تاریخ ۲، کاتک ۱۸۷۷ء سمت لکھی ہوئی ہے (۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۰ء) کاغذ یکسان پرانا اور کشمیری قسم کا ہے،

آج کل سمت ۱۹۹۵ء ہے، اس بنا پر اس رسالہ کی کتابت آج سے ایک سو انیس برس پہلے کی ہے، تصنیف کا زمانہ اس سے خدا جانے کتنے پہلے ہو،

بہرحال اس رسالہ جواہر الاسرار میں مصنف نے چند ہندی، فارسی اور عربی کے صوفیانہ لفظوں اور فقروں کی تشریح کی ہے، اس میں پنجابی ہندی یا اردو کے چند شعر بھی کہیں کہیں آگئے ہیں، اور وہی میری دلچسپی کا باعث ہوئے، ایک موقع پر "فنا و موج نسبت بر آب دارد، برائے این قلب گویند" یہ دوہرہ نقل کیا ہے،

جل ترنگ جلبیں تیں اپجی جلبیں راے سمائی، مائی میں مادھو میں مو میں مادھو ہوں توں نپج نسمائی

جملہ لاصلوٰۃ الا بحضور القلب (حدیث مشہور صوفیہ) کی تشریح میں ہے،

"وہمین ست ہرکہ در عالم یافت اورا ہمہ جا است وہرکہ در عالم نیافت اورا مشکل حق آسان کند، انشاء اللہ تعالیٰ،

اس کے بعد اس مضمون کا یہ دوہرہ ہے،

جنکو درشن اِت ہے اونکو درشن اُت جنکو درشن اِت نا نہ تنکو اِت نہ اُت

الصوفی لامذھب لہٗ کی تشریح میں دو شعر ہیں،

آپس آپ سو بسرا با اس دوجی بسری پہلے تس

یاد اکیلی رہے سو یاد اس من باقی سب برباد (ب)

وحدۃ الوجود کی ایک تمثیل کی تشریح میں ہے،

خدا سو بندا ہو دکھلائے، (بندہ) بندے خدا نہ نکھیا جائے،

کسی فقیر "عبدالفتاح" کا ایک فقرہ نقل کیا ہے،

"اے میاں ٹک پیچھے دیکھو" یعنی اے فلاں اندک پس بیں"،

ایک اور فقرہ کی تشریح کی ہے،

"کھوجی جیسے پی بادی مرے" کھوجی یعنی واس بادی یعنی مقابل معنی ہرکہ جوئندہ باشد تلاش دانستن داشتہ باشد او زندگی یابد وہرکہ یک چیز یافتہ برہمون یک چیز ویک مرتبہ وبر یک عمل ماند، ودر لذت ہمون یک عمل گرفتار شود لاف زند او مردہ برائے آنکہ او بیشتر راہ نیافت،

اس رسالہ میں سب سے دلچسپ چیز مشہور فقیر کبیر اور بیراگیوں کی ایک بات چیت کی بعینہ نقل ہے، جو اگر درست ہے، تو ہم کو کبیر کے زمانہ کی زبان کی ہو بہو تصویر نظر آجاتی ہے نقل لکھی ہے

تھے ایتیاں و بیراگیاں پیش کبیر آمدند، و گفتند کہ اے کبیر تون اتیت اور بیراگی ہے، تون واسطے تیرتھ کے اور استھان کے کیون نہیں چلتا، اٹھ تیرتھ کون اور استھان کو چل، کبیر گفت کہ بابا تم اتیت اور بڑی بیراگی ہو، اور میں اناڑی ہون تئیں جاؤ، میں پڑیا ہوں، بیراگیہا گفتند کہ نہ تون چل ہمارے ساتھ، یا بیراگ چھوڑ، کبیر الحاح کرد، و گفت بیراگیو مجھے چھو د و، بیراگیہا بگذاشتند، باز کبیر گفت کہ بہلاب کی مجھے چھو د و، اینھ تونبرا میرا لیجاؤ، اے تیرتھ اور اشنان کراؤ، دوسری بار میں چلوں گا، بہزار منت ماند و تونبرا ہمراہ داد، بیراگیاں تونبہ گرفتہ رفتند ہمہ جا تیرتھ داشنان کردند، تونبہ را ہم کنانیدند بعد از مدت آمدند پیش کبیر، کبیر پرسید، کہ تونبرا کہاں ہے، بیرگیاں گفتند کہ ہے، تونبہ را پیش کبیر گذاشتند، کبیر گفت کہ تونبرا کون تورو، بیراگیہا تونبہ راشکستند، باز کبیر گفت کہ کھاؤ، بیراگیہا خوردند، باز کبیر پرسید کہ کیہا ہے، بیراگیاں گفتند کہ کروا ہے، کبیر گفت کہ اے بیراگیو تیرتھ اور اشنان کیں کیا ہوتا ہے، جب ترتیں میتھا نہودے، یہ جو کڑوا تھا، تو تیرت اور اشنان سوں میتھا نہوا نہوا جائیگہ اصل میتھا نہ ہودی اس کے تئیں سنگت کروی، بیل کی تھی تو اسی میتھا کیونکر ہوئے، جو میتھی سنگت ہوتی، تو میتھا ہوتا، پس رفتن و پرسیدن و شنیدن و غوغا کردن چہ کار می آید"۔

کبیر کی وفات کا سال ۱۵۷۵ سمت مطابق ۱۵۱۸ء مشہور ہے، تو کیا یہ سولھویں عیسوی کی ہندوستانی بولی ہے،؟ کبیر کی شاعری کی زبان بھی بہت آسان ہے، اور اس میں عربی اور فارسی کے بگڑے ہوئے لفظ بہت ملتے ہیں،

آگے ایک اور شعر نقل کیا ہے، دوہرہ،

نہ دیکھ پرائی چوپڑی ناترسا اپنا جیو   روکھا سوکھا کھا کر ٹھنڈا پانی پیوہ،

تجھ کن علم سو ہے فی اسحال،   دی بصارت تجھے کی ل

ذوق ہوے نچن کر دیکھ،   نہیں بھوت کرتھیں ایسا پھیکہ

پھیکہ کہیں بیدیا نہیں کوئی   کھاند کہیں میٹھا نہیں ہو

بیدھے انتر جب جو ئی   جوں جھنگ کرنہیں بھرنکے ہوئی

دو بہنیں تھیں، بڑی بہن کا جب بیاہ ہوا، تو چھوٹی بہن نے پوچھا :۔

"بو بو بیاہ کیسا ہوتا ہے، این گفت کہون گی، جب چھوٹی بہن کا بیاہ ہو گیا، تو اس نے کہا بو بو بیاہ ایسا ہوتا ہے،

جو نہ دیکھے اپنین نین تون   تو نہ پیتجی کورکے بین تون

افسوس کہ رسالہ ناتمام ہے،

کلیاتِ شبلی اردو

مولینا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ، جس میں مثنوی صبح امید، قصائد، جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی، اور تاریخی نظمیں، جو کانپور، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کی چہل سالہ جد وجہد کی ایک مکمل تاریخ ہے،

لکھائی، چھپائی، کاغذ اعلیٰ، ضخامت ۱۲۰ صفحے، قیمت :- عہ

"منیجر"

فتح آباد

از

جناب نفیس الدین احمد صاحب ایم اے علیگ

نومبر ۱۹۳۸ء کے معارف میں سید انوری صاحب کا مضمون ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کی تاریخی غلطی شائع ہوا تھا، اس میں ایسی معلومات تھیں، جن کے متعلق امرتسر کے لوگوں کو علم نہ تھا،

موضع فتح آباد امرتسر کی تحصیل ترنتارن سے دس میل کے فاصلہ پر ہے، تین چار میل اس طرف موضع بھیروال ہے، جس کا ذکر انوری صاحب کے مضمون میں آیا ہے، اس موضع کے گرد پرانی شہر پناہ اب تک موجود ہے، اور زیادہ آبادی فصیل کے اندر ہے،

ترنتارن سے فتح آباد تک تین فرسخ بھی ہیں، دو اچھی حالت میں ہیں، اور تیسرا خراب ہوگیا ہے، پرانی اینٹیں اور پرانا چونا استعمال کیا گیا ہے،

فتح آباد پہونچتے ہی ایک عالیشان مسجد نظر آتی ہے، صحن کھلا اور فرش لگا ہوا، اندر کی عمارت سادہ ہے، مگر طرز تعمیر بتاتا ہے، کہ مغلیہ عہد کی عمارت ہے، مسجد کے صحن کا فرش خراب ہو چکا تھا، مقامی انجمن اسلامیہ نے ٹایل لگوا دیئے ہیں، اور جہاں کہیں مرمت کی ضرورت تھی کر دی گئی ہے،

اس مسجد کے پاس ایک بہت بڑا کنواں ہے، آگرہ میں قلعہ کے اندر جو کنواں ہے، وہ اس سے کسی قدر بڑا ہے، اس سے فتح آباد کے کنوئیں کا اندازہ ہو سکتا ہے،

مسجد کے شرق میں ایک عالیشان وسیع سرائے ہے، اسکے گرد اونچی دیوار ہے، جس میں برج بھی ہیں، اور مورچے بنے ہوئے ہیں، اس سرائے کے دو دروازے ہیں، جن پر نقش و نگار تھے، ان کا رنگ اب اکثر جگہ سے خراب ہوگیا ہے، اس کے اندر محلے آباد ہیں، وسط شہر میں ایک بازار ہے، جو سرائے کے بیچ میں سے گذرتا ہے،

عمارت تمام مغلیہ عہد کی معلوم ہوتی ہے،

شہر کے باہر ایک بڑا قبرستان ہے، جس میں بے شمار پرانی مگر پختہ قبریں ہیں،

دریای بیاس اب اس آبادی سے چار میل کے فاصلہ پر بہتا ہے، جو سڑک جالندھر سے اوتر کو جاتی ہے، وہ دس میل ہے، مسجد اور سرائے کے متعلق فتح آباد میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کب بنیں، اور کس نے بنائیں، عام خیال یہ ہے کہ شیر شاہ سوری نے بنوائی تھیں، مگر جس شخص نے پٹھان خاندان کے بادشاہوں کی تعمیر کردہ عمارتیں دیکھی ہیں وہ فوراً کہہ دیگا کہ یہ خیال غلط ہے،

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نور جہان نے بنوائی ہیں، اُنکی تائید میں یہ بات پیش کیجاتی ہے کہ دریا پار موضع نور محل ہے، جہان کی مشہور سرائے اب تک موجود ہے، چونکہ دہلی سے لاہور جانے کا یہ راستہ تھا اسلئے اپنے قیام کی خاطر دریا کے اس پار یہ عمارتیں بنوائیں،

شہر کے آباد ہونے کے متعلق مسجد یا سرائے میں کوئی کتبہ نہیں، اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ انکی تاریخ تعمیر کیا ہے،

شہر کے باہر چند کھنڈر ہیں، نہ معلوم کس عمارت کے ہیں،

کیا شہر کی تاریخ تعمیر کے متعلق کوئی صاحب مزید روشنی ڈال سکتے ہیں؟

تلخیص و تبصرہ

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس

اس دفعہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا اجلاس گذشتہ ستمبر میں بروسل (بلجیم) میں ہوا، اس کے صدر ایم، جین کیپارٹ (ڈائرکٹر، رائل میوزیم) تھے،

کانگریس مشرقیات کے مختلف علوم و فنون پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن یہان ہم صرف اسلامی شعبہ کا ذکر کریں گے، جس کی روداد ڈاکٹر کرنکو نے اسلامک کلچر (جنوری ۲۹ء) میں لکھی ہی،

کانگریس کی زبان انگریزی، فرانسیسی، جرمن یا اطالوی ہے، لیکن اس سال اسلامی شعبہ میں خطبے عربی اور اسپینی زبانون میں بھی پڑھے گئے، اس شعبہ مین مختلف موضوعوں پر مختلف اہل علم نے حسب ذیل مقالات پڑھے،

اپسالا کے ڈاکٹر لوف گرن نے ہمدانی کی کتاب الاکلیل کے پہلے اور دوسرے حصہ پر ایک مقالہ پڑھا، اس کا نسخہ برلن کے سرکاری کتب خانہ میں پایا گیا ہے، اب تک اس کتاب کے صرف آٹھویں اور نویں حصہ۔ کا پتہ چلا ہے، جن میں ایک تو بغداد سے شائع ہو چکا ہے اور ایک ابھی وہیں زیر ترتیب ہے، جو کبھی یمن کے مشہور عالم نشوان الحمیری کی ملکیت تھا،

رباط (مراکش) کے پروفیسر کولن نے ایک ایسی قدیم عربی کتاب پر مقالہ پڑھا جس میں پودون اور دواؤں کا حال ہے، یہ کتاب گیارھوین صدی عیسوی کے کسی نامعلوم اندلسی مصنف کی تصنیف ہے، اس کتاب کا حال ابن بیطار جیسے نباتاتی کو بھی معلوم نہ تھا، لیکن غافقی نے اس سے استفادہ کیا تھا، پروفیسر کولن نے وعدہ کیا ہے، کہ یہ کتاب بہت جلد چھپ کر شائع ہو جائے گی،

پروفیسر گوئڈی (روم) نے اپنے ایک خطبہ میں الکندی کی تصانیف کے ان قلمی نسخوں کا ذکر کیا، جو حال میں دستیاب ہوئے ہیں، ان میں سے بعض زیر طبع ہیں،

وی، اے، ہمدانی نے بعض مشہور شہروں اور قصبوں کی تاریخوں پر مقالہ پیش کیا، جو استنبول میں ان کو ملی ہین، ان میں سے ایک حاکم کی تاریخ نیشاپور ہے، جس میں عبد الغفار الفریسی ذی السیاق کے نام سے کچھ اور حالات اضافہ کئے ہیں، دوسری تاریخ مرو ہے، جس کے مصنف کا نام السمعانی ہے،

پروفیسر کریمر (لیڈن) نے عرب جغرافیہ نویسوں کی اہمیت دکھاتے ہوئے کہا، کہ وہ اسلامی تمدن اور دنیا کے لئے ضروری ہیں، پروفیسر موصوف نے ابن حوقل کے جغرافیہ کو از سر نو ترتیب دیا ہے، اور ادریسی کی کتاب کا ایک جدید اڈیشن ان کی نگرانی میں شائع ہوگا، جو سائنٹفک اصولون پر مرتب کیا جائے گا،

ام، کاہن (پیرس) نے شام اور اناطولیہ مین سلجوقی ترکون کی حکومت پر ایک مقالہ پڑھا، اس حکومت کے چار دور قائم کئے ہیں، پہلا دور بازنطینی حکومت پر ترکون کے حملہ سے شروع ہوتا ہے، دوسرا بازنطینی اور فاطمی قوت کے زوال سے، تیسرا ملک شاہ کی حکومت سے، اور چوتھا اس خاندان کے خاتمہ اور اناطولیہ میں سلجوقی سلطنت کے عروج سے شروع ہوتا ہے،

ڈاکٹر کاسکل نے عرب کے ایام جاہلیت کی تاریخ پر روشنی ڈالی، اور بتایا کہ دوسری صدی عیسوی میں نبطیون کی سلطنت کے زوال پر عربوں کی تشکیل کا آغاز ہوا، اسوقت بھی ان میں لسانی اعتبار سے دو قسمیں تھیں، جو اب تک قائم ہیں،

ام۔ مارکس (الجزائر) نے الحمرا (غرناطہ) کے آرٹ کے جمالیاتی پہلو پر ایک مقالہ پڑھا اور شمالی

افریقہ کی بعض عمارتوں پر اس کے اثرات دکھائے،

پروفیسر گب (آکسفورڈ) نے ایک تقریر میں کہا کہ ماوردی کی تصنیف خلیفہ کے نظریہ کے متعلق قطعی رائے نہیں ہے، ہنیوں کا بھی اس کے بارہ میں کوئی خاص نظریہ نہیں، لیکن ان کا خیال یہ ضرور ہے، کہ ایک صاحب حکومت وقوت امیر المومنین کافروں کے مقابلہ میں شریعت کو محفوظ رکھتا ہے،

ام۔ گبریل نے اناطولیہ کے سلجوقیوں کے ان مقبروں پر ایک مقالہ پڑھا، جو مشرقی ایران کے مقبروں سے ملتے جلتے ہیں،

پروفیسر بروکلمن نے مصر میں جدید عربی شاعری پر ایک مضمون پڑھا، اور یہ دکھایا کہ شروع میں یہ قدیم شاعری کے زیر اثر رہی، لیکن بیرونی خصوصًا فرانسیسی اثرات سے اس میں جدید عناصر پیدا ہوگئے ہیں،

پروفیسر ڈینی سن راس نے تیمور اور بایزید پر ایک مقالہ پڑھا، اور فارسی ماخذوں سے اس روایت کی تردید کی، کہ انقرہ کی جنگ کے بعد تیمور نے بایزید کو لوہے کے پنجرے میں مقید کیا تھا،

ڈاکٹر ریزی ٹانو نے اپنے مضمون میں یہ تجویز پیش کی، کہ قدیم عہد کے غیر معروف عربی شعرا کے دیوان شائع کئے جائیں، تاکہ پہلی صدی ہجری کے معاشرتی حالات معلوم ہوسکیں،

پروفیسر میسے (پیرس) نے جلائری خاندان پر ایک مقالہ پڑھا، جو عراق اور ایران میں مغلوں کی سلطنت کے بعد برسر اقتدار رہا، اسی سلسلہ میں مقالہ نگار نے کہا کہ اگر اس عہد کی بعض دستاویزیں اور شاہی فرامین جو پیرس اور دوسرے ممالک میں محفوظ ہیں شائع کردیئے جائیں تو ان سے بہت سے نئے معلومات حاصل ہوں گے،

ام بلیشرے نے دیوان متنبی کی اس شرح پر روشنی ڈالی، جو العکبری کی جانب منسوب ہے،

مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ شرح العکبری کی نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک ہمعصر کی ہے،

پروفیسر کالے (بون) نے ابن دانیال کے ڈراموں کے شائع کرنے پر زور دیا، جو اسکوریال کے کتبخانہ میں محفوظ ہیں، اور ازمنہ وسطیٰ کے عربی ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے،

پروفیسر لیوی پرونکل نے ایک ایسی کتاب پر مقالہ پڑھا، جو ان کو فاس میں ملی ہے، اور جو سکوں کے اصطلاحات پر ہے، بظاہر یہ کتاب (Mhamide) حکومت کے ٹکسال کے کسی افسر کی لکھی ہوئی ہے،

ڈاکٹر او بنیٹو (روم) نے تجویز کیا، کہ مشرق کے اطالوی سیاحوں کے سفرنامے شائع کئے جائیں، تاکہ مشرقی ممالک کے حالات معلوم کرنے میں آسانی ہو،

مسٹر جی، گوم (لندن) نے "الازرقی" کے استناد پر ایک عرب نوآبادی دربند کا ذکر کیا جو ایران کے شمال میں واقع تھی،

پروفیسر عطیہ (بون) کا مقالہ مصر کے قبطیوں پر تھا، اس کے بعض حصے مصر کے مسلمانوں کی عہد کی تاریخ سے بھی متعلق تھے،

پروفیسر طٰہٰ حسین (قاہرہ) نے یہ دکھایا کہ جدید طریقہ پر عربی کس طرح پڑھائی جانی چاہئے

پروفیسر نمیت (بداپست) نے ہنگری میں مشرقی علوم وفنون کی تعلیم کا جو سامان ہے اس پر تبصرہ کیا،

ڈاکٹر میر نے بیت المقدس میں عبرانی یونیورسٹی کے علمی کارناموں پر ایک تقریر کی، اور اعلان کیا، کہ اس کی طرف سے بلاذری کی کتاب الاشراف کی دوسری جلدیں بہت جلد شائع ہوں گی،[1]

[1] معارف:- ایک جلد شائع ہو چکی ہے،

الجزائر کے ام ادریس لمارے نے اس صنعت پر مضمون پڑھا، کہ کس میکنک طریقہ سے عثمانی مصحف خطبہ کے وقت ایک طاق سے چکر کھا کر منبر پر چلا آتا تھا، مضمون نگار نے یہ بھی بتایا کہ یہ طریقہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی رائج تھا[1]،

الجزائر کے ام بیرسے نے مصر کے جدید ناولوں پر مقالہ پیش کیا، اس میں یہ بتایا کہ اول اول ۱۸۷۰ء میں ناول سیاسی اغراض کے تحت لکھے گئے، پھر رفتہ رفتہ مصر، شام اور عراق میں زیادہ تر ان کے موضوع معاشرتی مسائل ہونے لگے، "ض، ع"

عصبی المزاجی کا نفسیاتی مطالعہ

ہم میں بعض ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں، جو لوگوں سے ملنے جلنے یا کسی جلسہ میں شریک ہونے سے سخت گھبراتے ہیں، اور پریشان خاطر ہوتے ہیں، خصوصاً جب ان کو کوئی پبلک کام کرنا یا کسی اسٹیج پر تقریر کرنی ہوتی ہے، تو ان کا ذہنی خلجان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، بظاہر یہ عصبی المزاج ہونے کا اثر ہے، مگر یہ غور کرنے کی بات ہے، کہ سوسائٹی اور معاشرت میں اس عصبی المزاجی کے اسباب کیا ہیں،؟ ماہرینِ نفسیات یہ بتاتے ہیں کہ جس شخص کو اپنی ذات کا احساس جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ عصبی المزاج ہوگا، بعض اشخاص محض اس وجہ سے خوش نہیں رہتے ہیں کہ لوگوں کی تعریف وتحسین سے محروم ہیں، لوگ ان کی ذات سے دلچسپی نہیں لیتے ہیں، اور وہ جو کچھ کرتے یا کہتے ہیں، اس کی طرف لوگ توجہ نہیں کرتے، چنانچہ ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ جاتا ہے، کہ وہ کسی غیر معمولی شخصیت کے مالک نہیں ہیں، جو لوگوں کی توجہ کے قابل اور انکی تعریف کی مستحق ہو،

اس قسم کے احساسات اس غلط خیال کا نتیجہ ہیں، کہ معاشرت کی کامیابی لوگوں کی

[1] معارف:- اس آلہ کا پورا حال مولینا شبلی نے رسائل شبلی میں لکھا ہے،

تعریف وتوصیف ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، اس میں شک نہیں کہ لوگوں کی مدح وستایش مقبولیت کی دلیل ہے، جو بہت ہی خوشگوار اور خوش آیند پہلو رکھتی ہے، مگر اس کو اپنی خوشی کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا، معاشرت کی کامیابی تو خود افراد ہی پر منحصر ہے کہ وہ زندگی، اور ملنے جلنے والے لوگوں کے متعلق خود ایک خاص نقطۂ نظر سے سوچیں، وہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کو پسند کریں، اور ان کی یہ خواہش اتنی شدید ہو جاتی ہے، کہ وہ اس کو بھول جاتے ہیں، کہ پہلے انہیں خود دوسروں کو پسند کرنا سیکھنا ہے، ان پر یہی خیال چھایا رہتا ہے، کہ فلاں بات کے سلسلہ میں انھوں نے لوگوں پر کیسا اثر قائم کیا،؟ ان کی رائے کا وزن کیا رہا، انھوں نے تعریف کی یا نہیں،؟ بعض اوقات تو وہ محض نکتہ چینی کے خوف سے ان ہی چیزوں کو پسند کرتے ہیں، جن کی طرف عوام کا میلان ہوتا ہے، خواہ انھیں وہ باتیں پسند ہوں یا نہ ہوں، نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ وہ فطری طبیعت سے الگ ہو کر شعوری انتشار اور تحت الشعوری بے اطمینانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جو انہیں عصبی المزاج بنا دیتی ہے، ہر شخص کی نظروں میں مقبول ہونا ممکن نہیں، اور اگر ممکن ہے، تو پھر ہماری شخصیت مفلس اور قلاش رہے گی، اس میں شک نہیں کہ ایماندار بننا اپنی مقبولیت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، لیکن قلبی طمانیت اور ذہنی سکون ایمانداری ہی سے حاصل ہو سکتا ہے،

اپنی ذات کے احساس اور نکتہ چینی کے خوف کی وجہ سے ہماری ساری توجہ اپنی ذات ہی کی طرف منعطف ہو جاتی ہے، جس سے اپنے کردار کا ہر نقص بڑا معلوم ہونے لگتا ہے، یہی وجہ ہے، کہ ہم اپنے کو دنیا کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے دنیا کو اپنی نسبت سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں، اور جب ساری توجہ اپنی ذات، اپنے خیالات اور اپنے تفکرات کی طرف مائل رہتی ہے، تو ہمارا نقطۂ نظر بھی بدل کر بگڑ جاتا ہے، اور پھر ہماری آنکھیں دنیا اور دنیا کے لوگوں کی زندگی کو دیکھنے کے بجائے صرف اپنی ذات اور انا کو دیکھتی ہیں،

عام طور سے یہ مرض لڑکپن ہی سے پیدا ہو جاتا ہے، خصوصًا جب لڑکوں پر والدین کی نگاہ سخت رہتی ہے، ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے ان کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ نسبتہً اور لڑکوں سے گھٹیا اور کمتر ہیں، اور بزرگوں کی شفقت حاصل کرنے کے لئے ان کو خاص جد وجہد کرنی پڑیگی، اس کے لئے وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ وہ کوئی ایسی بات یا کام کریں کہ ان کی تعریف ہو، اور ان کے بزرگ ان کو اپنی شفقت اور محبت کا مرکز بنائیں، اگر ان کو اس میں ناکامیابی ہوتی ہے، تو وہ میٹھے میٹھے خیالات کی ایسی دلفریب دنیا تعمیر کرتے ہیں، جس میں لوگ ان کے تخیل کے تعمیر کردہ کمالات اور کارناموں پر رطب اللسان ہیں، پھر وہ اسی خیالی دنیا میں مگن رہنا چاہتے ہیں، اور لوگوں سے ملنے جلنے میں ان کو پریشانی ہوتی ہے،

معاشرتی عصبی المزاجی سے بچنے کی آسان صورت صرف یہ ہے کہ ہم کو اپنی ذات کا احساس زیادہ نہ ہو، ہر عمل میں اپنی برتری کی خواہش انسان کو بہت ہی غمگین بنا دیتی ہے، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو تھوڑی کامیابی سے خوش اور مطمئن نہیں ہوتے، بلکہ وہ غیر معمولی کامیابی اور مقبولیت ہی حاصل کرکے مطمئن ہونا چاہتے ہیں، وہ کھیلتے ہیں تو ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ سب سے اچھا کھیلیں، جب تقریر کرتے ہیں تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تقریر فصاحت وبلاغت کا نمونہ ہو، اس خبط کی وجہ سے ان کو ذہنی انتشار و مایوسی اور عصبی اختلال و پریشانی کا شکار ہونا پڑتا ہے، جس کے ذمہ دار وہ خود ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ لوگ ان کی ہر کامیابی سے دلچسپی لیتے ہیں، اور ان کی ہر ناکامی پر دوسروں کو افسوس ہوتا ہے، حالانکہ لوگ اپنے مشاغل کی الجھنوں میں خود اس قدر پریشان خاطر رہتے ہیں، کہ ان کو دوسروں کی کامیابی اور ناکامیابی سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے،

سلامت روی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہرگز یہ نہ سوچیں، کہ ہم کو اپنے ہر کھیل اور کام میں

دوسروں سے بازی لیجا کر اور برتر بن کر معاشرت میں کامیابی حاصل کرنا ہے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم اپنی گفتگو میں بہت ہی زیادہ دلچسپ اور ظریف ہوں، گفتگو کو سنجیدگی سے سننا طریقہ اور دلچسپ گفتگو کرنے سے زیادہ اہم اور ضروری ہے، ہماری تقریر مختصر ہی سہی لیکن وہ موضوع کے مطابق ہو، تو وہ ضرور پسند کی جائے گی، بشرطیکہ حاضرین پر ہم اپنی ذات اور اہمیت کا خاطر خواہ اثر ڈالنے کے لئے پریشان نہ ہوں،

کامیابی کا بڑا راز دوسروں کی ذات سے دلچسپی لینے میں ہے، نہ کہ لوگوں کی تعریف اور مذمت کرنے کے خوف میں غلطاں و پیچاں رہنے میں، اگر لوگ ہماری ذات سے دلچسپی نہیں لیتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم افسردہ اور مغموم ہوں، معاشرت میں کامیابی محض وقت اور موقع سے حاصل ہوتی ہے، ہمارا سابقہ جن لوگوں سے ہو ممکن ہے کہ وہ بہت محتاط، قدامت پسند، اور ہماری ہی طرح عصبی المزاج ہوں، لیکن اگر ہم اپنے ذوق کے اظہار میں سلامتی کو راہ دیں، تو وہ ضرور رفتہ رفتہ ہماری طرف مائل ہوں گے، اگر ہم میں لطف، کرم اور اخلاق کے صفات موجود ہیں، تو ان کا میلان ہماری طرف تیزی سے بڑھ سکتا ہے،

جب ہم کسی اجنبی سے ملیں یا کوئی پبلک کام کریں، یا کسی جلسہ میں شریک ہوں تو ہم کو محض اشتیاق اور دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، ہم کو تازہ واقعات جاننے اور لوگوں سے واقف ہونے کا مشتاق ہونا چاہئے، تاکہ ہماری معلومات میں غیر محدود طریقہ پر اضافہ ہوتا رہے، اور ہم اپنی توجہ کو اپنی ذات اور اپنے خیالات سے ہٹا کر دوسرے لوگوں اور انکے خیالات کی طرف مائل کر سکیں، اسوقت عصبی المزاج ہونا، اور محض اپنی ذات سے دلچسپی لینا بھول جائیں گے، اور یہی عادت آگے چل کر غیر محسوس ذہنی رجحان بنجائے گی، ہمیں چاہئے، کہ لوگوں کی نکتہ چینیوں کیطرف توجہ کرنے کے بجائے لوگوں کو پسند کرنا سیکھیں تاکہ ممکن ہو

کہ بعض لوگوں کو ہم پسند نہ کرتے ہوں، لیکن اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہ کریں، ہمارا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے، کہ ہم اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک ہمدردانہ لگاؤ پیدا کریں، اور یہ اسی وقت ممکن ہے، کہ جب ہم کسی سے ملیں، تو اس طرح کہ اس کو یہ احساس ہو کہ ہم کو اس سے مل کر واقعی دلچسپی اور خوشی ہوئی ہے،

جو لوگ محض لوگوں سے خراج تحسین حاصل کرنے کے کوشاں رہتے ہیں، ان کو وقتی کامیابی تو ہو سکتی ہے، مگر وہ ان کو آگے نہیں لیجا سکتی، اصلی معنوں میں معاشرتی کامیابی وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں، جو دوسروں کو متاثر کرنے کے بجائے خود ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں، اور ان سے اچھی اچھی باتوں کو اخذ کر کے کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم جتنا زیادہ فطری ہوں گے، اتنا ہی کم عصبی المزاج ہوں گے، اور اپنے کاموں اور دلچسپیوں میں اپنی ذات کو بھلا دیں تو پھر معاشرت میں کامیابی حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں،

"ص ع"

فاتحہ تفسیر نظام القرآن

مولینا حمید الدین مرحوم کی عربی تفسیر کا دیباچہ جس میں اونھوں نے اپنے اصول تفسیر کی تشریح کی ہے، اور بسم اللہ الرحمن الرحیم اور سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھی ہے، چھپ کر شائع ہو گیا ہے، امید ہے کہ اہل علم اور خاص طور سے علمار اس کی پوری قدر کریں گے،

ضخامت ۴۴ صفحے، قیمت: ۲؎

منیجر دفتر الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

اخبار علمیہ

ولیم میکڈوگل

گذشتہ نومبر میں انگلستان کے مشہور ماہر نفسیات ولیم میکڈوگل کا انتقال ہو گیا، وہ ۱۸۷۱ء میں لنکاشائر میں پیدا ہوا، منچسٹر میں تعلیم پا کر کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوا، اور آخر میں لندن یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کی، لیکن نفسیات میں اس کا مطالعہ اتنا گہرا تھا کہ وہ لندن یونیورسٹی میں اس کا لکچرار مقرر ہوا، اور پھر ذہنی فلسفہ کا پروفیسر ہو کر آکسفورڈ چلا گیا، ۱۹۲۰ء میں وہ ممالک متحدہ بلا لیا گیا، جہاں وہ ہارورڈ اور ڈیوک یونیورسٹی میں معلمی کے فرائض انجام دیتا رہا،

اس نے مندرجۂ ذیل کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے ہر ایک کے بہت سے اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، (۱) خلاف معمول نفسیات کا ایک خاکہ (۲) ذہین اجتماع (۳) نفسیات کردار کا مطالعہ (۴) مردوں کی قوتیں، (۵) زندگی کا مذہب اور سائنس (۶) بورنیو کے غیر شائستہ قبائل (۷) معاشرتی نفسیات کا مقدمہ (۸) نفسیات کا ایک خاکہ (۹) زندگی کی سیرت اور طور و طریقے، ان میں "معاشرتی نفسیات کا مقدمہ" زیادہ مقبول ہے، نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لئے "نفسیات کا ایک خاکہ" بھی مفید اور ضروری کتاب ہے، "زندگی کی سیرت اور طور طریقے" آسان اور عام پسند ہے،

ولیم میکڈوگل نے نفسیات کے اتنے مختلف نظریئے قائم کئے ہیں، کہ ان پر آیندہ بہت سی کتابیں اور شرحیں لکھی جائیں گی، لیکن اس نے سب سے زیادہ "جبلت" پر لکھا ہے، جبلت کی تعریف اس

نے یہ کی ہے کہ حسب منشا، کام کرنے کی ایک فطری اور پیدائشی صلاحیت کا نام ہے، جو انسان کے علاوہ جانوروں، پرندوں اور کیڑوں میں بھی پائی جاتی ہے، ولیم میکڈوگل کے خیال کے مطابق چودہ جبلتیں ہوتی ہیں، مثلاً نقل، کھیل، خوشی، محبت، نفرت، غصہ، رنج، لڑائی، فرار، بے چینی، غول بندی، جنسی خواہش وغیرہ، بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ جبلتیں صرف تین ہی ہوتی ہیں، خود غرضانہ معاشرتی اور جنسی، مگر میکڈوگل نے دکھایا ہے، کہ ان تینوں میں سے ہر ایک کی علحدہ علحدہ قسمیں ہیں جن میں مذکورۂ بالا چودہ جبلتوں کی تطبیق صحیح صحیح ہو جاتی ہے،

ولیم میکڈوگل کا خیال ہے کہ ایک انسان اپنی جبلتوں کا محض تودہ نہیں ہوتا، اور نہ وہ ایک دوسرے سے بالکل علحدہ رہتی ہیں، بلکہ ان میں باہمی ربط ہوتا ہے، اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ انسان جبلت کے تغیر میں مجبور ہے، صحیح تربیت اور نشو و نما سے جبلت جذبہ میں اور جذبہ وجدان میں بدلا جا سکتا ہے، ولیم میکڈوگل نے سارا زور افراد اور اقوام کے وجدان پر دیا ہے، جس سے ایک قوم کو دوسری قوم کا مطالعہ کرنے میں بڑی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں،

روس کا علمی ذوق

۱۹۳۶ء میں سویٹ روس سے ۱۰،۵۲۱ اخبارات شائع ہوئے، جن کی مجموعی اشاعت ۳۶،۱۹۷،۰۰۰ ہے، ۱۹۱۳ء میں زار کے زمانہ میں صرف ۸۵۹ اخبارات شائع ہوتے تھے، جن کی کل اشاعت ۲،۷۲۹،۰۰۰ تھی، ان اخباروں کے علاوہ ۱۰۰۰ رسالے نکلتے ہیں، جو ۱۵۰ ملین کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں، اخبارات مختلف انہتر زبانوں میں چھپتے ہیں، کتابیں بھی کثرت سے شائع ہوتی ہیں، عام طور سے ٹکسالی ناولوں کی مانگ کثرت سے ہے، ۱۹۱۷ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان لینن کی تصنیفات بہتر زبانوں میں شائع ہوئیں اور ان کے ۲۶،۴۲۶،۰۰۰ نسخے فروخت ہوئے،

جن میں صرف ۲۳،۳۵۲،۰۰۰ نسخے روس کے باشندوں نے خریدے، ٹالسٹائی کی کتابیں ۴۵ زبانوں میں شائع ہوئیں، اور ۱۵،۹۲۶،۰۰۰ بکیں، میکسم گورکی کی تصانیف ۵۰ زبانوں میں شائع ہو کر ۳۶،۹۲۳،۰۰۰ بکیں، سویٹ روس کے باشندوں کو غیر ملکی ادب العالیہ سے بھی بڑی دلچسپی ہے، کوئی کتب خانہ ایسا نہیں ہے، جس میں شکسپیر، بائرن، ڈکنس، گیٹے، زولا وغیرہ کی تمام تصانیف موجود نہ ہوں، ۱۹۱۷ء-۱۹۳۶ء میں ڈکنس کی کتابیں سات زبانوں میں شائع ہوئیں، اور ان کے ۱،۲۴۰،۰۰۰ نسخے فروخت ہوئے، شکسپیر کے ڈرامے چودہ زبانوں میں ترجمے کئے گئے اور یہ ۷،۳۰۰،۰۰۰ کی تعداد میں نکلے، ان کے مقابلہ میں ہمارے ملک کا ذوق دیکھئے!

بجلی کی خاموش کوند

۱۸۸۵ء میں واشنگٹن کے مینارہ کو بجلی سے شدید صدمہ پہونچا تھا، لیکن کسی نے بجلی کے گرنے کی آواز نہیں سنی تھی، اس زمانہ میں یہ واقعہ محض درج کر لیا تھا، اب تک اس کا سبب دریافت نہ ہو سکا تھا، حال میں امریکہ کے ایک محقق نے تین سال کی محنت کے بعد اس کی وجہ دریافت کی ہے، اس کی تحقیق ہے، کہ بجلی کی پیدائش کی تیزی سے ہوا میں اچانک وسعت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی لہروں پر اتنا دباؤ پڑتا ہے، کہ اس سے کڑک پیدا ہوتی ہے، لیکن بجلی کی ہر ایک چمک سے قوتوں کا اخراج یکساں نہیں ہوتا، بعض بجلی کی لہریں بہت ہی کم اور سست ہوتی ہیں، اون کا اخراج سکنڈ کے ۱/۲ حصے میں ہوتا ہے، حالانکہ عموماً بجلی اپنے اخراج میں سکنڈ کا کڑوڑواں حصہ لیتی ہے، سست اخراج ہونے والی بجلی میں کڑک نہیں ہوتی،

———·———

پرانی ہڈیوں کے بجائے نئی ہڈیاں

برسٹل یونیورسٹی کے مشہور سرجن ڈاکٹر ارنسٹ ولیم گروز نے حال ہی میں اپنے طبی تجربات کے سلسلہ میں بعض دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں، مثلاً ۲۲ئہ میں ایک لڑکے کی کمر کے نیچے کی ہڈی ٹوٹ گئی، ڈاکٹر موصوف نے انسان کی ہڈی جوڑ کر اس کو درست کرنا چاہا، لیکن اسمین کامیابی نہیں ہوئی، تو اس نے تجربۃً دریائی گھوڑے کے دانت کو ٹوٹی ہوئی ہڈی میں جوڑ دیا، گذشتہ اکتوبر مین عکسی شعاعوں سے معاینہ کیا گیا، تو ہڈی بالکل جڑی ہوئی پائی گئی اور مریض میں ابتک کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی،

ایک دوسرے دس برس کے لڑکے کے بازو کی ہڈی کہیں سے ٹوٹ گئی تھی، ڈاکٹر مذکور نے اوس کو بیل کی ہڈی کے دو ٹکڑوں کو نیچے اوپر رکھ کر ملا دیا، چھ ہفتے میں لڑکا بالکل ٹھیک ہو گیا، اور آگے چل کر وہ بہت مشہور کھلاڑی ہوا، دس برس کے بعد عکسی شعاعوں سے جوڑ کا معائنہ کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ بیل کی ہڈیاں لڑکے کی ہڈیوں میں بالکل پیوست ہو گئی ہیں،

ایک عورت کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی، ڈاکٹر موصوف نے اس کو بارہ سنگھے کے سینگ سے ملا کر درست کیا، اور ایک سال کے بعد وہ ایسا صاف چلنے لگی، کہ اوس کی دونوں ٹانگوں میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا، تین سال کے بعد بارہ سنگھے کی ہڈی مریضہ کی ہڈی میں بالکل پیوست ہو گئی،

ض ع

ادبیات

خونِ جگر

از جناب جگر مراد آبادی،

عشق فنا کا نام ہے، عشق میں زندگی نہ دیکھ
جلوۂ آفتاب بن، ذرہ میں روشنی نہ دیکھ

جلوۂ رنگ رنگ کی دیکھ ہما ہمی نہ دیکھ
ایک جگہ ٹھہر نہ جا، غور سے تو کبھی نہ دیکھ

شوق کا مرثیہ نہ پڑھ، عشق کی بے کسی نہ دیکھ
اُنکی خوشی خوشی سمجھ، اپنی خوشی خوشی نہ دیکھ

شوق کو رہنما بنا ہو جو چکا کبھی نہ دیکھ
آگ دبی ہوئی نکال آگ بجھی ہوئی نہ دیکھ

دل کو مٹا کے عشق میں دل کی طرف کبھی نہ دیکھ
ہو کے نثارِ زندگی، حاصلِ زندگی نہ دیکھ

دل کی لگی بجھائے جا، تیز قدم اٹھائے جا
رخصتِ شوق کی قسم فرصتِ زندگی نہ دیکھ

پہلے جہانِ رنگ و بو تا بہ کمال دیکھ جا
رہروِ منزلِ سلوک اپنی طرف ابھی نہ دیکھ

یہ تو نہیں کہ آنکھ کو دعوتِ ماسوا نہ دے
ہاں مگر اس قدر کہ بس ایک ہی رخ کبھی نہ دیکھ

موت و حیات میں ہے صرف ایک قدم کا فاصلہ
اپنے کو زندگی بنا، جلوۂ زندگی نہ دیکھ،

حسنِ مجاز سے گذر یعنی جو تجھ سے ہو سکے
دیکھ کے ایک بار پھر بارِ دگر کبھی نہ دیکھ

تو ہی کمالِ عشق ہے تو ہی کمالِ حسن ہے
اپنے سوا کسی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ

ناصحِ کم نگاہ سے کوئی یہ کہہ کے سر کھپائے
رازِ شکستگی سمجھ، رنگِ شکستگی نہ دیکھ

یہ بھی تری طرح کہیں رُخ سے نقاب الٹ نہ دے　　حسن پہ اپنے رحم کر، عشق کی سادگی نہ دیکھ

ہو کے رہیگا ہم نوا وہ بھی ترے ہی ساتھ ساتھ　　نغمۂ شوق گائے جا، حسن کی برہمی نہ دیکھ

ہے یہی عین دوستی اپنی طرف سے اے جگرؔ

دستِ کرم بڑھائے جا، غیر کی دشمنی نہ دیکھ،

شورِ نشورؔ

از

جناب نشورؔ واحدی،

ہمیں اے کردگار، کفر و دیں سب کام آتا ہے　　مگر تیرے غمِ توحید پر الزام آتا ہے،

نگاہِ آدمی کا آج تک جب نام آتا ہے　　وہی رعنائیاں لیکر خیالِ خام آتا ہے

سرابِ زندگی کو یاد رکھ اے تشنۂ عقبیٰ　　تماشا آج کا دیکھا ہوا کل کام آتا ہے

کشش اے جذبۂ کامل مدد اے ہمتِ عالی　　کہ پھر مجھکو خیالِ کوششِ ناکام آتا ہے

نہ پوچھو زندگی تارِ نفس پر جینے والوں کی　　کہ مرگِ ناگہاں کا ہر نفس پیغام آتا ہے

محبت اور پھر ضبطِ محبت اف معاذ اللہ　　خدا کا سامنا ہے اور کسی کا نام آتا ہے

تجھے اے حسنِ عالم سوز آخر کب خبر ہوگی　　کہ بربادِ تمنا کوئی زیرِ بام آتا ہے

مسلسل شامِ غربت شامِ فرقت شامِ بیماری　　میرا دل کانپ جاتا ہے جو لفظِ شام آتا ہے،

نشورؔ پاک دل کی پاکیٔ انفاس کیا کہنا

صفائے قلب ہوتی ہے، جب اسکا نام آتا ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

خاتم النبیین، مولفہ جناب ابراہیم عمادی صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۳ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ اسمعیل بیگ محمد ہائی اسکول بمبئی نمبر ۳،

اردو میں آئے دن سیرت پاک پر کتابیں نکلتی رہتی ہیں، سیرت کے مضامین و مباحث محدود و متعین ہیں، اسلئے ان میں تو کوئی نیا اضافہ کیا نہیں جاسکتا، عقیدت مند اپنے ذوق و نظر کے مطابق انہی مباحث کی ترتیب و طرز بدل کر نئے نئے انداز سے پیش کرتے ہیں، خاتم النبیین بھی اسی قسم کا ہدیہ عقیدت ہے، اس کے چار حصے ہیں، پہلے حصہ میں کلام اللہ سے سات اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے حالات و تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، دوسرے حصہ میں باستثنائے غزوات قبل نبوت سے لیکر حجۃ الوداع تک سیرت پاک کے تعمیری حالات ہیں، مثلاً تبلیغی جد وجہد، مخالفین کا زغہ، تبلیغِ اسلام کے نتائج اور اسکی ترقی وغیرہ، تیسرے حصہ میں بڑے بڑے غزوات کے مختصر حالات ہیں، انہیں ضمناً صحابۂ کرام کے جوشِ جہاد کے واقعات اور جنگ میں اسلام کی اصلاحات کا بھی مختصر ذکر ہے، چوتھے حصہ میں اخلاق و شمائل نبوی کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، واقعات مستند اور زبان صاف اور سادہ ہے، بچوں کے لئے یہ کتاب خصوصیت کیساتھ زیادہ مفید ہے، لیکن بعض واقعات کو ایسے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے جن سے انکی صورت بدل گئی ہے، مثلاً حضرت زیدؓ اور حضرت خبیبؓ کے متعلق جنھیں کفار نے دھوکا دیکر گرفتار کر لیا تھا، اور مکہ میں لیجاکر ان کے دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، لکھتے ہیں کہ "قریش تو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، ہی کچھ روز تک بھوکا پیاسا رکھا

اس کے بعد تڑپا تڑپا کر جان سے مار ڈالا" اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ کفار نے انھیں بھوک سے تڑپا تڑپا کر شہید کیا، حالانکہ یہ واقعہ نہیں ہے، نہ انھیں بھوکا رکھا، اور نہ اس طرح سے مارا بلکہ حضرت خبیبؓ کو سولی دیگئی، اور حضرت زیدؓ کو تلوار سے شہید کیا گیا،

ہٹلر اعظم مولفہ جناب پروفیسر جیدر سکھ صاحب شاستری تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۸۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت تین روپیہ مجلد پتہ سیاسی لٹریچر کمپنی نمبر ۱۱۸۱ مسجد کھجور دہلی،

اس نئے سیاسی دور میں جرمنی اور اٹلی کے آمر دن ہٹلر اور مسولینی نے دنیا کے سامنے فسطی طرز حکومت کا کامیاب نمونہ پیش کیا ہے، اس کے بارہ میں دو رائیں یا دو گروہ ہیں، ایک گروہ کا خیال ہے، کہ اس طرز حکومت نے ترقی یافتہ جمہوریت کو ختم کرکے پھر دیو استبداد کو زندہ کیا ہے دوسرا اسے ملکی اور قومی ترقی کے لئے مفید خیال کرتا ہے، اس اختلافِ خیال کی بنا پر ان آمرون کے متعلق بھی متضاد خیالات ہیں، مذکورۂ بالا کتاب آمریت کی تائید وحمایت میں لکھی گئی ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ ہٹلر جو کچھ کر رہا ہے، وہ ان مظالم کا ردعمل اور لازمی نیتجہ ہے، جو جنگ عظیم کے بعد جرمنی پر توڑے گئے، اگر ہٹلر نہ پیدا ہو گیا ہوتا، تو جرمنی مر کر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا تھا، اس کتاب کے شروع میں جرمنی کی قدیم مختصر تاریخ ہے، اس کے بعد ہٹلر کے سوانح حیات ہیں چونکہ اسکے سارے کارنامے جرمنی کے احیار سے متعلق ہیں، اس لئے اس کتاب میں جنگ عظیم کے آغاز سے لیکر اس وقت تک کی جرمنی کے زوال وعروج کی پوری تاریخ آگئی ہے، کہ جنگ عظیم میں جرمنی کس طرح شریک ہوا، دوران جنگ میں وہان کیا کیا انقلابات و حوادث ہوئے، کس طرح قیصریت کا خاتمہ ہوا، اور جنگ عظیم کے بعد کس طرح جرمنی کا خاتمہ کیا گیا، پھر ہٹلر پیدا ہوا، اور اس نے اندرونی و بیرونی مشکلات کا مقابلہ، اور تمام مخالف قوتون کو مغلوب

کرکے جرمنی کو دوبارہ زندہ کیا اس طرح اس کتاب میں ۱۸۷۱ء سے ۱۹۳۳ء تک کی جرمنی کی پوری سیاسی تاریخ آگئی ہے، کتاب نہایت دلچسپ اور مفید ہے،

مبادی سیاسیات مولفہ پروفیسر ہارون خانصاحب شروانی صدر شعبۂ تاریخ وسیاسیات جامعہ عثمانیہ، تقطیع اوسط ضخامت ۵۱۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت تین روپئے مجلد، غالباً مصنف سے ملے گی،

سیاسیات یعنی حکومتوں کے سیاسی نظام، ان کے اجزاے ترکیبی، اس کے ارتقا کی تاریخ اور موجودہ حکومتوں کے دستور پر پروفیسر ہارون خانصاحب شروانی نے دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا پہلا حصہ عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے، یہ کتاب اس کا دوسرا حصہ ہی، اس میں حسب ذیل مباحث ہیں، اعضاے حکومت اور تفریق اختیارات، حکومت کی قسمیں، منفرد و مرکب مملکتیں، مقننہ، جماعت عاملہ، سیاسی فرقہ بندی، محکمۂ عدلیہ، مقامی حکومت، توابع و مساتیر، بین الاقوامی حیثیت، اور قانون بین الاقوام کے چند نکات وغیرہ، دستور حکومت کے تمام اجزا پر تفصیل کیساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، ان میں سے جس کی ابتدائی شکلیں قدیم حکومتوں میں ملتی ہیں، ان کو بھی ظاہر کر دیا گیا ہے، ہر بحث کے آخر میں موجودہ حکومتوں کے دستوروں سے اس کی مثالیں دی گئی ہیں، اس طرح اصول کیساتھ ان کی عملی تشریح بھی ہو گئی ہے، اور موجودہ حکومتوں کے دستورون سے واقفیت بھی ہو جاتی ہے، زبان آسان اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے، آخر میں انگریزی اور اردو مصطلحات کا انڈکس بھی دیدیا ہے، آج کل ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہی، ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے،

بنی اسرائیل کا چاند، مترجمہ جناب عبد المجید صاحب حیرت بی اے علیگ، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۱۲؍ پتہ مکتبہ جامعہ دہلی،

یہ کتاب انگریزی زبان کے مشہور مصنف "رائڈر ہیگرڈ" کی تصنیف ہے، اس میں بنی اسرائیل کی فرعون کی غلامی اوران کی آزادی کی داستان کو ناول کے پیرایہ میں دکھایا گیا ہے، بنی اسرائیل پر مصریوں کے مظالم فرعون کو اسرائیلی انبیار کی تنبیہ، فرعونیوں کا تمرد، ان پر مصائب کا نزول حق و باطل کی معرکہ آرائی، فرعون کی غرقابی اور بنی اسرائیل کی آزادی وغیرہ کل واقعات کو نہایت دلچسپ طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، ان خشک واقعات کو پرلطف بنانے کے لئے مصنف نے فرعون کے ولی عہد سیٹی اور ایک معصوم اور مظلوم اسرائیلی لڑکی میرا پی کی داستانِ عشق و محبت بھی شامل کردی ہے، شاہزادہ سیٹی اپنے خاندان کے برعکس نہایت حمدن منصف مزاج، حق پرست، دنیاوی شان و شکوہ سے بے نیاز اور اپنی قوم کے خلاف مظلوم بنی اسرائیل کا ہمدرد اوران کی آزادی میں مددگار ہے، اس کی سزا میں اسے بڑی بڑی آزمایشوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تاج و تخت سے محروم کیا جاتا ہے، چنانچہ فرعون کی موت کے بعد اس کے بجائے شاہی خاندان کا ایک دوسرا رکن عمن میس تخت پر بٹھایا جاتا ہے، لیکن شاہزادہ سیٹی حق کی حمایت سے باز نہیں آتا، یہی فرعون مع خدم وحشم کے غرق ہوتا ہے اس کے بعد شاہزادہ سیٹی کو تخت ملتا ہے، عین اس وقت اس کی محبوبہ میرا پی مصریوں کے سحر کے اثر سے مرجاتی ہے، شاہزادہ اس کے مردہ جسم کو تاج پہنا کر تخت نشین کرتا ہے، اور اس کے بعد ہی خود بھی راہئی عدم ہوتا ہے، اس ناول میں فراعنہ کے جلال وجبروت، عہد فراعنہ کی سحر وساحری، اور قدیم مصری تمدن کی پوری تصویر آگئی ہے، کوئی واقعہ بغیر آب ورنگ دیئے ہوئے افسانہ نہیں بن سکتا، اسلئے اس میں اصل واقعات پر بہت کچھ اضافے ہیں، لیکن افسانہ نہایت دلچسپ ہے، اور مترجم نے کامیاب ترجمہ کیا ہے،

"م"

جلد ۴۳ | ماہ صفر المظفر ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۹ء | عدد ۴

مضامین